www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10 ₹

National Council for Promotion of Urdu Language

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

فروری 2020

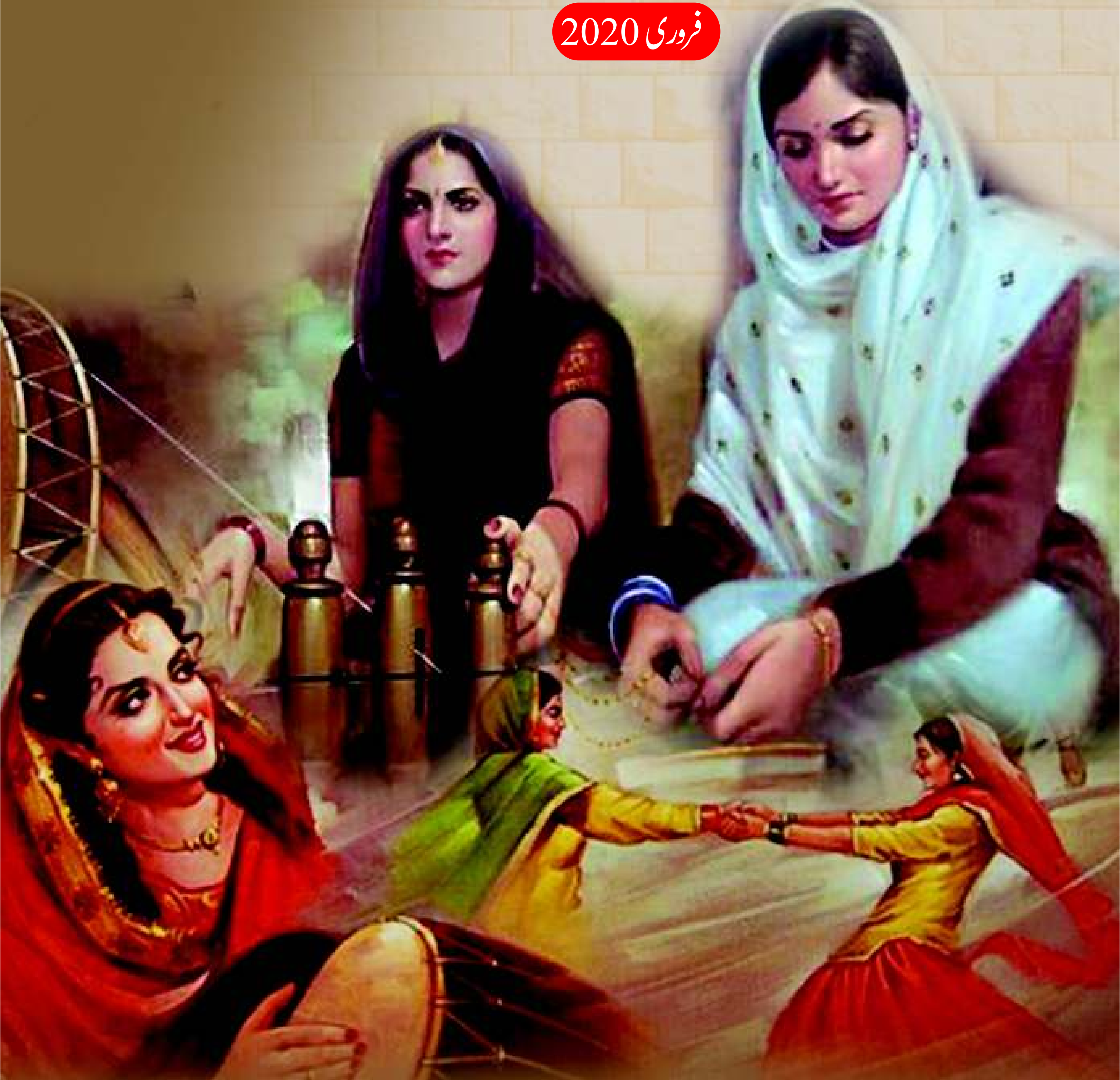

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 2 فروری 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی- 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	جیلانی بانو کا سماجی و سیاسی شعور	ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	5
نکہتِ سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		10
جہانِ نسواں	انسانی شخصیت (ایک اساسی مضمون)	ساجدہ زیدی	11
	اردو کا داستانوی ادب: ایک مطالعہ	عشرت جہاں	15
	راشد الخیری کا نظریۂ تعلیم نسواں	زیب النساء	18
	اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کے نسوانی کردار	فرح	24
	دیوداس: ایک مطالعہ	رائحہ انصار	31
	قیدی کا کمبل اور احمد فراز	انصاری شاہین عبدالحکیم	35
کہانیاں	ریچھ	شاہدہ شاہین	38
	شگفتہ باجی	ڈاکٹر نسرین بیگم	41
	متاعِ زیست	ڈاکٹر ریشا قمر	43
حسنِ سخن	طلعت سروہا		47
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		48
صحت	معدنی عناصر اور پانی	شکیل احمد	50
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

اردو زبان میں لوک ادب کی تاریخ کافی قدیم رہی ہے۔لوک گیتوں کی لسانی، تاریخی اور ثقافتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لوک گیتوں کا سلسلہ صدیوں سے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا آرہا ہے۔اس میں عوام کے جذبات کی عکاسی ان ہی کی زبان میں کی جاتی تھی۔ان لوک گیتوں میں کئی طرز کے گیت موجود ہوتے تھے۔موجودہ دور میں قدیم رسم و روایات سے بے توجہی برتی جا رہی ہے،اس لیے لوک گیت کی روایت بھی آہستہ آہستہ دم توڑتی جارہی ہے۔

صدیوں سے لوک گیتوں کو اہمیت کا حامل سمجھا جاتا رہا ہے لیکن زندگی کے ہر میدان میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کے باعث ہم اپنی ثقافتی اور تہذیبی زندگی سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں۔آج بہت سی روایات معدوم ہوچکی ہیں لوک گیت کی روایت بھی انھیں میں سے ایک ہے جبکہ لوک گیتوں کو عوام کے اظہار کا موثر ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔لوک گیتوں کو عوامی ادب یا عوام کے ذریعہ تخلیق کیا گیا ادب بھی قرار دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیوں کہ اس میں اس عہد کی لسانی اور ادبی تہذیب جھلکتی ہے جس عہد میں وہ پروان چڑھتا ہے۔لوک ادب یا لوک گیتوں کا خالق کوئی ایک شخص نہیں ہوتا بلکہ عوام ہوتی ہیں۔اس میں عوام کے جذبات کی عکاسی ان ہی کی زبان میں ہوتی ہے۔موجودہ دور میں لوک گیتوں کی طرف سے انسانوں کی دلچسپی ختم ہوتی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی لوک گیتوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

دنیا کی ہر بڑی زبان میں لوک گیتوں کی روایت موجود رہی ہے۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان میں ادب کی تخلیق کا آغاز ہی لوک گیتوں کے ذریعے ہوا ہے۔لیکن موجودہ دور میں اس صنف سے اجتناب برتا گیا ہے،اس لیے دیگر اصناف کی طرح اس صنف کو بہت عروج حاصل نہیں ہوسکا۔لوک گیتوں پر اکا دکا کتاب ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔لوک ادب یا لوک گیتوں پر دیگر اصناف کی طرح بہت زیادہ تعداد میں تحقیقی کام تو نہیں ہوا ہے لیکن وقتاً فوقتاً لوک گیتوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد نے اس پر تحقیقی کام کیا ہے۔

پرانے زمانے میں جبکہ انسانی ذہن اتنا متحرک نہیں ہوا تھا،اس وقت وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر اپنوں کے بیچ میں وقت گزارتا تھا۔گھر میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی تقاریب مثلاً بچے کی ولادت، سالگرہ، شادی بیاہ کو اہتمام کے ساتھ منانے کی روایت تھی۔گھر میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں اس وقت خواتین کی دلچسپی کا اہم ذریعہ بنتی تھیں۔پرانے زمانہ میں مکان بہت کشادہ ہوا کرتے تھے۔اس زمانہ میں وقت کی بھی کوئی قلت نہیں تھی۔شادی بیاہ کے موقع پر اپنی دلچسپی کو ظاہر کرنے کے لیے خواتین گھر میں ہی گیت اور رقص کی محفلیں آراستہ کرتی تھیں۔یہ تقریبات ہی اس وقت ان کی دلچسپی کا اہم ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔خواتین شادی کی تقریبات کو اور زیادہ خوشنما بنانے کے لیے مہینوں ان کی تیاری میں صرف کرتی تھیں اور اس میں پورے زور شور سے حصہ لیتی تھیں۔لیکن آہستہ آہستہ وقت کی تبدیلی کی وجہ سے انسانوں کی فرصت کے اوقات کم ہوتے گئے۔اس دوری کی وجہ بھی روزی روٹی کی فکر اور ذریعۂ معاش تھا۔حصول رزق کی خاطر انسان گاؤں سے شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگا۔اس ہجرت کی وجہ گاؤں میں بڑھتی بے روزگاری اور اقتصادی حالات بہتر نہ ہونا تھے۔گھر کے معاشی حالات کو مزید بہتر بنانے کی غرض سے انسانوں نے شہروں کو ہی اپنا مسکن و محور بنایا اور شہروں میں ہی مقیم ہونے لگا۔نتیجتاً ذہنی طور پر انسان انسان سے دور ہوتا گیا۔بہتر زندگی جینے کی خواہش نے انسان کو مشینی بنادیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے اطراف کے ماحول سے ایک حد تک بےگانہ رہتا ہے۔

لوک ادب سے خواتین کا گہرا تعلق ہے کیونکہ یہ خواتین کی دلچسپی کے ذریعے ہی یہ تخلیق پاتا ہے۔لوک گیتوں کو خواتین کی ادبی، لسانی اور تہذیبی شناخت کا اہم حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔لوک گیت صدیوں سے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہے ہیں لیکن موجودہ دور میں لوک گیتوں کی جگہ آج مختلف تفریحات نے لے لی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی اپنی قدیم رسوم و روایات سے کم ہوتی جارہی ہے۔اردو لوک گیتوں پر بے توجہی کی وجہ سے اردو لوک ادب کے تحفظ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس صنف کی طرف توجہ دی جائے اور اس صنف پر یونیورسٹیوں کی سطح پر تحقیقی کام انجام دیئے جائیں اور ان کی اشاعت کی جائے تاکہ ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو آگے بڑھنے میں مدد مل سکے اور ہم اپنی اس خوبصورت روایت کو فروغ دے سکیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

جیلانی بانو

کا سماجی و سیاسی شعور

(راستہ بند کے حوالے سے)

جیلانی بانو اردو فکشن کی دنیا میں ایک خاص مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ان کا نیا افسانوی مجموعہ ''راستہ بند ہے'' ذہن وفکر کے نئے دریچوں کو کھولتا ہے۔اس افسانوی مجموعے میں متنوع سماجی و سیاسی موضوعات جیسے عالمی سیاست،ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ میں آگے نکل جانے کی ہوڑ،امریکہ کا احساس برتری اور دنیا کے تحفظ کی آڑ میں انسانیت پر بربریت کا مظاہرہ، اسلامی ممالک کی خاموشی ،ہندوستانی سیاست کی کالا بازاری،فرقہ وارانہ فسادات،صارفی اور مشینی زندگی میں فرد کی تنہائی اور اپنے وجود کو منوانے کی کوشش میں سرگرداں مشرقی عورت وغیرہ پر بہت ہی خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔ یہ موضوعات ان کے سماجی و سیاسی شعور کا بین ثبوت ہیں۔اس مجموعے میں ان کا طرز اسلوب جدت پسندانہ ہے۔افسانہ ''عباس نے کہا'' کو ایک ٹیلی ویژن نیوز کی نشریات کے انداز میں پیش کیا ہے۔عراق کی جنگ کے واقعات کو ایک ٹی وی چینل کے نیوز اینکر اور رپورٹر کی زبانی پیش کیا ہے،جو تکنیک کے لحاظ سے خاصا جدت پسندانہ ہے،جنگ کی تباہی اور جنگ کا پس منظر دونوں قاری پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔اس افسانے میں مصنفہ کا طنزیہ لہجہ عراق کے معصوم لوگوں پر ہوئے مظالم کے خلاف ایک باشعور اور حساس انسان کا ردِعمل ہے۔یہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں کربلا کی سرزمین پر ایک بار پھر حق وباطل کے درمیان لڑائی ہوئی۔اس بار بھی لوگوں نے حق کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔لیکن عین وقت پر پیچھے ہٹ گئے جس طرح حضرت امام حسینؓ کو بیعت دے کر پیچھے ہٹ گئے تھے اور تماشائی بنے سب کچھ دیکھتے رہے۔اس بار بھی پیاسوں کی پیاس بجھانے والے عباس کے ہاتھ کٹ گئے۔عراق کی جنگ کے دل دہلا دینے والے مناظر پوری دنیا نے ٹیلی ویژن چینلز پر دیکھے۔ٹیلی ویژن نیوز رپورٹنگ کے انداز میں لکھے گئے اس افسانے میں ایک نیوز ریڈر اسٹوڈیو میں بیٹھ کر خبریں سناتے سناتے جنگ کی تازہ ترین صورتحال سے واقف کرانے کے لیے اپنے ناظرین کو live اپنے نیوز رپورٹر (سمواد داتا) کے پاس لے جاتا ہے جو ہر منظر کو پوری تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔جن ہتھیاروں سے دنیا کو خطرہ تھا وہ ہتھیار تو عراق میں نہیں ملے لیکن ویسے

ہی ہتھیاروں سے عراق کو برباد کر دیا گیا۔ اس تباہی پر نہ ہی اقوام متحدہ نے امریکہ سے جواب طلب کیا اور نہ ہی عالمی برادری میں کسی ملک نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات کی بلکہ اس سے تو دنیا میں امریکہ کی برتری ثابت ہوگئی ۔اس افسانے میں مصنفہ نے اسلامی ممالک کی خاموشی پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے انھیں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اور ساتھ ہی افسانے میں عہد حاضر کی commercialization اور میڈیا کی پالیسیوں اور TRP کی جنگ وغیرہ کا بیان مصنفہ کی عصری آگہی اور عمیق مشاہدے کا پتہ دیتے ہیں ۔وہ الیکٹرانک میڈیا کے impact اور اس کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں ۔ایک ہندی نیوز بولیٹن کے انداز میں افسانہ پیش کرنے کے لیے ہندی الفاظ جیسے سموادداتا، سماچار، درشک، وشیش چتر، سمبھاؤنا، کھاڑی یودھ اور جانکاری کے لئے دھنیہ واد، جیسے الفاظ کا بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔

مصنفہ نے افسانہ ''درشن کب دوگے'' میں مذہب کی ظاہر داری اور سماجی خدمت کے نام پر ہو رہی ریاکاری پر طنز کیا ہے ۔اعلیٰ طبقہ، دولت مند گھرانوں، اونچی سوسائٹی کے لوگوں کی بے حسی Social workاور ہمدردی کا دکھاوا کر کے شہرت حاصل کرنے کی خواہشات کی نقاب کشائی کی ہے۔انھیں کسی کا گھر جل جانے، کسی کے زخمی ہوجانے یا کسی کے مرجانے کا کوئی افسوس نہیں ہے اور نہ ہی کسی سے ہمدردی ہے بلکہ وہ تو کرفیو ختم ہونے اور فسادات ٹھنڈے پڑجانے کے بعد متاثرین کی آبادکاری کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے دوران اپنی ڈریسنگ اور نیوز چینلس کے Coverage کو لے کر فکر مند ہیں کہ کوئی ان سے سبقت نہ لے جائے۔ یہ لوگ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انھیں شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ افسانہ انسان کی بے حسی اور شہرت پسندی پر طنز ہے جو صارفی زندگی کی دین ہے۔افسانے سے ایک اقتباس دیکھیے:

''اچھا اب کی بار فساد ہوا تو انشاء اللہ اتنا فنڈ اکٹھا کردوں گی کہ ٹی ۔وی پر پرائم منسٹر کے ساتھ مسکراتی نظر آوں۔''

(ص: 30)

موجودہ دور کی فیشن پرستی میں سماجی خدمت جیسے جذبہ کو بھی لوگوں نے فیشن بنا دیا ہے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں ایسے نام نہاد سماجی خدمت گزاروں کی ستائش ہوتی ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں انعامات سے نوازا جاتا ہے۔

''درشن کب دوگے'' خالص بیانیہ انداز میں لکھا گیا افسانہ ہونے کے باوجود اس میں ایک نیا پن یہ ہے کہ مصنفہ نے کرداروں کو تعارف کرانے سے پہلے ان شخصیتوں کے قول محال (Paradox) کو نمایاں کرنے کے لیے استفہامیہ انداز کو اپنایا ہے۔ وہ کردار کا نام بتا کر استفسار کرتی ہیں ۔پھر کردار کی مثبت اور منفی خصوصیات سے واقف کراتی ہیں بیانیہ کی یہ ندرت کہانی میں انوکھا پن اور دلچسپی پیدا کرتی ہے۔ گویا وہ کردار ایک فرد یا کردار نہیں رہتا بلکہ سماج میں اپنی جیسی ذہنیت والے لوگوں کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

'مولوی صاحب ۔کون مولوی صاحب؟

''ارے وہی مولوی صاحب جو اپنے سوا ہر انسان کو دوزخ میں بھجوانے کا انتظام کر چکے ہیں ۔جنھوں نے مذہب کو ہوّا بنا رکھا ہے۔''(ص:34)

''پجاری کونسا پجاری؟''

''ارے وہی پجاری جو مندر کے دروازے پر کھڑا دیکھ رہا ہے کہ آنے والا ہریجن ہے یا برہمن، منسٹر ہے یا بھکاری۔ پھر وہ حکم دیتا ہے کہ لائن بنا کر آؤ۔''تم کونسی لائن میں کھڑے ہو کر بھگوان کے درشن چاہتے ہو۔ یہ سو روپے والی لائن ہے۔ یہاں تم بہت جلد بھگوان کے درشن کرلوگے یہ دس روپے والی لائن ہے ۔یہاں بھگوان اپنے پکارنے والوں کے پاس سات گھنٹے بعد بھی آسکتے ہیں ۔''

(ص:33)

آج بھی ہندوستان میں مذہب کے نام پر عام آدمی کو لوٹا جاتا ہے۔ یہ عام آدمی توہم پرستی اور قدامت پرستی میں مبتلا اپنے آپ کو ان مذہب کے ٹھیکیداروں کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کی اسی کمزوری کے سبب ان کی دکانیں چلتی ہیں ایک طرف مذہب کو کاروبار بنا دیا گیا ہے تو دوسری طرف ہندوستانی سیاست دانوں کے لیے مذہب ایک ہتھیار ہے جس کا استعمال وہ اپنی سیاسی پارٹی کو مضبوط بنانے' ووٹ بینک کو Cash کرانے اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں اپنی سیاسی روٹیاں سینکتے ہیں ۔یہ آگ انسان کو جنگلی جانور سے بھی زیادہ خونخوار اور خوفناک درندہ بنادیتی ہے۔ افسانہ ''بھاگو بھاگو'' میں فرقہ پرست فسادی جب آشا اور اس کے بچوں کو مارنے کے لیے پیچھا کرتے ہیں تو وہ اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے دوڑتے دوڑتے ''زو'' (Zoo) میں پہنچ جاتی ہے ۔اور اپنے بچوں کو لے کر شیر کے پنجرے میں چلی جاتی ہے ۔اقتباس ملاحظہ ہو:

"بھاگو۔ بھاگو۔ وہ بھاگتی رہی۔ یہ تو جنگل تھا نہیں۔"زو" تھا۔ سامنے خوفناک شیر منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ (جب تک انھیں انسان سے خطرہ نہ ہو شیر حملہ نہیں کرتا) ایک امریکن لڑکا کہہ رہا تھا اور آشا جلدی سے بچوں کا ہاتھ تھامے شیر کے پنجرے میں گھس گئی۔ اب وہ مطمئن تھی کہ درندوں کے چنگل سے نکل گئی تھی۔"

شیر کے پنجرے میں جا کر آشا کا مطمئن ہو جانا' انسان کی حیوانیت اور درندگی پر گہرا طنز ہے اور امریکن لڑکے کا یہ کہنا کہ جب تک انھیں انسان سے خطرہ نہ ہو شیر حملہ نہیں کرتا' ایک بہت اہم سوال قائم کرتا ہے کہ گویا انسان جانور سے بدتر ہو گیا ہے یعنی جانور بھی معصوم اور بے گناہ لوگوں پر حملہ نہیں کرتا تو انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ کہیں مذہب کے نام پر کہیں علاقے کے نام پر ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہندوستانی سیاست کی اس تصویر کو مصنفہ نے "ایک شوٹنگ اسکرپٹ" میں ایک منفرد انداز میں شوٹنگ لوکیشن پر ہونے والی سرگرمیوں کو تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس میں بہت ساری ٹیکنیکل باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے جیسے اسکرپٹ رائٹنگ کی باریکیاں، ایکٹرس کا گیٹ اپ، میک اپ، سین کا فوکس، کیمرہ کا angle اور ٹرالی کی movement وغیرہ وغیرہ۔

موجودہ دور میں صارفیت کے سبب پیدا ہونے والے مسائل پر بھی مصنفہ کی گہری نظر ہے۔ صارفیت نے علم، اخلاق، انسانی اقدار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ جیلانی بانو نے "یہ شہر بکاؤ ہے" میں ان عصری مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ یہ افسانہ آج کے صارفی دور کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نیوکلیائی ہتھیاروں کی ہوڑ دنیا میں امن و امان اور انسانیت کی بقا کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ جیلانی بانو کی وسعت فکر اس طرح کے عالمی مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ "موت کے بیج" میں دراصل ترقی پذیر ممالک کی دفاعی پالیسیوں اور ترجیحات پر طنز کرتے ہوئے مصنفہ نے انھیں ہدفِ تنقید بنایا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جتنا پیسہ دفاع کے نام پر اور مختلف طرح کے ہتھیار، میزائلس اور ایٹم بم بنانے کی ریسرچ پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر اتنا ہی پیسہ زراعت اور کاشتکاری پر بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے پر خرچ کیا جائے تو ملک میں کوئی بھوکے پیٹ نہیں سوئے گا۔

"راستہ بند ہے" یہ اس مجموعے کا اہم افسانہ ہے کہ اسی کے عنوان پر مجموعے کا عنوان بھی رکھا گیا ہے۔ یہ ایک سادہ لیکن دلچسپ افسانہ ہے جو شہر کے چوراہے کے منظر کی تصویر پیش کرتا ہے۔ جہاں سے چیف منسٹر کا قافلہ گزرنے والا ہے بیری کیٹس لگا کر راستہ عام لوگوں کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں کار، آٹو رکشا، موٹر سائیکل اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم لگ جاتا ہے۔ دراصل اس افسانے میں مصنفہ نے موجودہ سیاسی سسٹم کی وجہ سے عام آدمی کو پیش آنے والی مشکلات کو بیان کیا ہے۔ بچوں کو امتحان کے لیے اسکول وقت پر پہنچنا ہے' کسی کو انٹرویو کے لیے دیر ہو رہی ہے، کوئی بیمار ہے اور درد سے کراہ رہا ہے اسے بھی ہسپتال پہنچنے کے لیے راستہ کھلنے کا انتظار کرنا ہے' کوئی سر پر بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، کسی کو دفتر وقت پر نہ پہنچنے پر منیجر کے عتاب کا ڈر ستا رہا ہے۔ لیکن کوئی بھی وہاں سے بیری کیٹس کے ہٹنے سے پہلے نکل نہیں سکتا اگر پہلے نکلنا ہے تو پولیس والوں کی مٹھی گرم کرنا پڑے گا۔ گرمی کی چلچلاتی دھوپ ہو یا موسلا دھار بارش انھیں راستہ کھلنے تک وہیں کھڑے رہنا ہو گا۔ چوراہے کا یہ منظر عام آدمی کی مشکلات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں جن میں رشوت

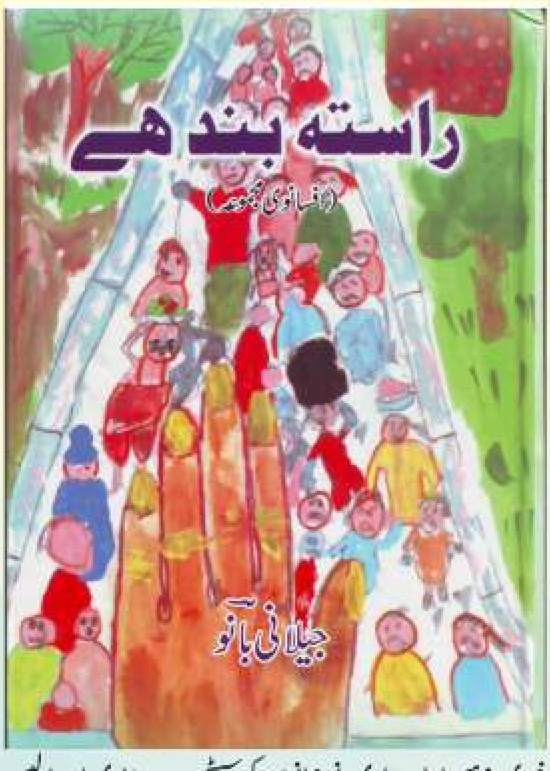

خوری، مذہبی اجارہ داری، نوجوانوں کی سسٹم سے بیزاری اور پولیس والوں کی ظلم و زیادتیاں شامل ہیں۔ مصنفہ نے رمزیہ انداز میں موجودہ دور کے متنازعہ فی اور سلگتے ہوئے موضوع پر بڑی بے باکی سے قلم اٹھایا

ہے کہ ہر بم بلاسٹ کے بعد پولیس کی تحقیق و تفتیش پر سوال اٹھاتی ہیں کہ پولیس والے جب اصلی مجرم تک نہیں پہنچ پاتے ہیں تو جواب دہی اور میڈیا کے پریشر سے بچنے کے لیے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو گرفتار کر کے ان پر ظلم کیا جاتا ہے۔

رشوت خوری' کالا دھن اور کالا بازاری نے ہندوستانی معیشت کو دیمک کی طرح اسے اندر سے کھوکلا کر دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا سرکاری کام بھی رشوت کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ برتھ سرٹی فیکٹ سے لے کر ڈیتھ سرٹی فیکٹ کی اجرائی بغیر رشوت کے ممکن نہیں ہے۔ رشوت کی مخصوص اصطلاحیں مروج ہیں جیسے چائے پانی کے لیے کچھ دے دینا، منہ میٹھا کرانا، مٹھی گرم کرنا اور انڈر دی ٹیبل لین دین وغیرہ۔ عام آدمی کے تحفظ کی ضامن، شہریوں میں نظم و ضبط اور امن و امان کو قائم رکھنے اور مجرموں کے شر سے بچانے کا تیقن دلانے والی پولیس کے افسر بھی اکثر و بیشتر اس میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ جہاں زندگی کے بہت سے کام آسان ہو گئے ہیں۔ وہیں خود زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی کا انحصار اشیا کی موجودگی اور عدم موجودگی پر ہے۔ زندگی کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے انسان جنگ کی طرح جٹ جاتا ہے۔ جب جنگ لڑتے لڑتے اسے تھکان کا احساس ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ جن کے لیے اس نے یہ جنگ لڑی جائز ناجائز کچھ نہیں دیکھا اب انھیں اس کی ضرورت ہی نہیں رہی یہ آج کے رشتوں کا سچ ہے جنھیں ہم ضرورت کے ترازو میں تولتے ہیں۔ موجودہ دور کی مشینی اور صارفی زندگی میں فرد کی تنہائی کو جیلانی بانو نے ''ایک دوست کی ضرورت ہے'' میں موضوع بنایا ہے۔ ڈرائیور کی ضرورت، خانساماں

''سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ جہاں زندگی کے بہت سے کام آسان ہو گئے ہیں۔ وہیں خود زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی کا انحصار اشیا کی موجودگی اور عدم موجودگی پر ہے۔ زندگی کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے انسان جنگ کی طرح جٹ جاتا ہے''

کی ضرورت اور ملازم کی ضرورت کی طرح ''ایک دوست کی ضرورت'' کا اشتہار اخبار میں دیا جاتا ہے یہ اس ترقی یافتہ طبقے کی تصویر ہے جہاں سماجی رشتے دم توڑ رہے ہیں۔

''بچے مجھ سے دور چلے گئے ہیں۔ دوستوں کو میرے ساتھ ہولی کھیلنا یاد نہیں رہتا بیوی کو اپنی محرومیاں اور میری حماقتیں یاد آتی ہیں۔ صبح شام کی طرح اب ہم دونوں اکٹھے نہیں بیٹھتے کبھی''۔

مادی ترقی کے پیچھے دوڑنے والا انسان کیسے انسانی رشتوں سے دور ہو جاتا ہے اس کا اندازہ مصنفہ کے بس ایک جملے سے لگایا جا سکتا ہے کہ صبح شام کی طرح اب ہم دونوں اکٹھے نہیں بیٹھتے کبھی۔ رشتوں میں پیدا شدہ خلا کو پر کرنا اب ناممکن لگتا ہے اور رشتوں کے بکھراؤ سے تنہائی انسان کا مقدر بنتی جارہی ہے۔

''مادی ترقی کے پیچھے دوڑنے والا انسان کیسے انسانی رشتوں سے دور ہو جاتا ہے اس کا اندازہ مصنفہ کے بس ایک جملے سے لگایا جا سکتا ہے کہ صبح شام کی طرح اب ہم دونوں اکٹھے نہیں بیٹھتے کبھی۔ رشتوں میں پیدا شدہ خلا کو پر کرنا اب ناممکن لگتا ہے اور رشتوں کے بکھراؤ سے تنہائی انسان کا مقدر بنتی جارہی ہے''

بڑھتی مصروفیتیں، گھٹتی محبتیں، بدلتے اقدار یہ انسان کی مادی ترقی کی دین ہے، ہمارے دور کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مادیت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور روحانیت دبتی جارہی ہے۔ شہر آباد ہو رہے ہیں لیکن گھر اجڑ رہے ہیں۔ سماج میں دن بہ دن بڑھتے جرائم کے واردات کے پیچھے کی وجوہات اور مجرموں کی نفسیات کا وہ تجزیہ کرتی ہیں کبھی کبھی سماجی بندشیں ہی ان کے لیے ذمہ دار ہوتی ہیں۔ مصنفہ نے افسانہ اکیلا میں ایک ایسے بچے کی ذہنی و جذباتی کیفیت کی عکاسی کی ہے جو ایک کربناک سچ کو جان لیتا ہے کہ وہ ناجائز ہے۔ اس کا احتجاجی رویہ اور اس کی زبان کی نشتریت اس کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے اٹل کا تبدیلیِ قلب کرا کے اسے مثالی کردار نہیں بنایا۔ وہ اپنی نفسیاتی الجھن کے چلتے اپنی محبوبہ کا قتل کر دیتا

ہے۔ یہ عمل اسے تسکین پہنچاتا ہے کہ اب دنیا میں اس جیسی اذیت ناک زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔

''راستہ بند ہے'' میں کچھ افسانے ایسے ہیں جو تانیثی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیے جانے کے متقاضی ہیں۔ان میں ''پردہ گرتا ہے''، ''اسے کس نے مارا''، ''کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے'' اور ''گل نغمہ'' قابل ذکر ہیں۔مصنفہ کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے۔کبھی مذہب کے نام پر کبھی جنس کے نام پر تو کبھی رشتوں کی آڑ میں اس کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔آج عورت اس استحصال کے خلاف اپنے وجود کی لڑائی میں سرگرداں ہے۔یہی شعور جیلانی بانو کی تحریروں میں عورت کے وجود کو تسلیم کروانے اور اسے مساویانہ حقوق دیئے جانے سے منسوب ہے۔

''راستہ بند ہے'' میں کچھ افسانے ایسے ہیں جو تانیثی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیے جانے کے متقاضی ہیں۔ان میں ''پردہ گرتا ہے'' ''اسے کس نے مارا''، ''کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے'' اور ''گل نغمہ'' قابل ذکر ہیں۔مصنفہ کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے۔کبھی مذہب کے نام پر، کبھی جنس کے نام پر تو کبھی رشتوں کی آڑ میں اس کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔آج عورت اس استحصال کے خلاف اپنے وجود کی لڑائی میں سرگرداں ہے۔یہی شعور جیلانی بانو کی تحریروں میں عورت کے وجود کو تسلیم کروانے اور اسے مساویانہ حقوق دینے جانے سے منسوب ہے۔''

افسانہ ''کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے'' میں طنزیہ ومزاحیہ اسلوب میں لکھے اس افسانے میں مصنفہ نے ایک تیر سے دو نشانے لگائے ہیں۔پہلا نشانہ تو عورت پر ہونے والی زیادتیوں پر ہے اور اپنے طنز کے تیر کا دوسرا نشانہ جدید تنقید اور تنقید نگاروں کو بنایا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح کنہیالال کپور نے اپنے مضمون ''غالب جدید شعرا کی مجلس میں'' میں جدید شاعری اور مشاعروں کے ذریعے بدلتے اقدار کو طنز کا نشانہ بنایا تھا۔ مشاعرے اردو تہذیب وثقافت کی پہچان ہوا کرتے تھے۔وقت کے ساتھ صرف شاعری ہی نہیں بدلی بلکہ مشاعروں کا مزاج بھی بدلنے لگا۔جس کو کنہیالال کپور نے لطیف طنزیہ ومزاحیہ انداز میں پیش کیا تھا۔اس مضمون میں غالب جدید دور کی وزن سے عاری بے قافیہ وبے ردیف شاعری سن کر گھبرا جاتے ہیں اور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔اُسی طرح اس مضمون میں بھی جیلانی بانو جب غالب کو جدید تنقید کے طریقہ کار اور تنقیدی پیمانوں کے بارے میں بتاتی ہیں تو وہ جلد سے جلد مفر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس مجموعے میں مصنفہ نے بے حد اہم موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں جس سے ان کی عصری حسیت اور سماجی وسیاسی شعور کی پختگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔'افسانہ راستہ بند ہے' میں ایک بوڑھی عورت جس کے گھر کو مسمار کر دیا گیا ہے وہ عدالت سے انصاف ملنے کی امید لگائے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی ہے اور ایک لڑکے سے عدالت کا پتہ پوچھتی ہے۔لڑکے کے جواب میں پوشیدہ طنز نشتر کا کام کرتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ مظلوم کس سے فریاد کرے کیونکہ انصاف کے سارے راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔

''آپ کے لیے وہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے ماں جی جہاں انصاف ہوتا ہے آگے راستہ بند ہے'' یہ جملہ انصاف کا راستہ بند ہے ہمارے پورے سسٹم پر کاری ضرب لگاتا ہے۔

اس مجموعے کے افسانے اپنے عہد کی سیاسی وسماجی زندگی کے نقیب ہیں۔آج جب ہم اپنے آس پاس نظر ڈالتے ہیں تو سیاسی افراتفری، سماجی اور تہذیبی انتشار اور مذہبی بحران کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ بارود کے ڈھیر پر بیٹھی دنیا، امن کی بحالی کے لیے لڑی جانے والی جنگیں، پل پل بڑھتا عدم تحفظ کا احساس، جھوٹ اور مایوسی کے اندھیرے میں معصوم رمشا کے ننھے ہاتھوں میں تھمے قلم سے مصنفہ کو امید کی کرن نظر آتی ہے۔ان کی ساری امیدیں نئی نسل، اس کی سوچ اور اس کے قلم سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔

□□□

Dr. Bibi Raza Khatoon
Assistant Professor
Dept. of Urdu
MANUU, Hydearbad- 500 032 (Telangana)

شاعرات کے منتخب اشعار

حسیں لحات گزرے تھے کبھی جن کے کناروں پر
انھیں چشموں کی یہ شیریں صدائیں یاد کرتی ہیں

نگاہیں بن کے جو تم پر کبھی قربان ہوتی تھیں
تمھیں اسما کے دل کی وہ دعائیں یاد کرتی ہیں

اسما سعیدی

مرا وجود تو مٹی کا اک گھروندا ہے
مرا ضمیر گھروندے میں اک دیا سا ہے

اس شہر کج کلاہ کے آثار دیکھنا
اور خود کو بے ردا سر بازار دیکھنا

عشرت آفرین

میں روایت ہوں ایک بھولی ہوئی
اور تو جدتوں میں رہتا ہے

گو کہ بستر تھے سنگ ریزوں کے
خواب پھولوں کے دیکھتے تھے ہم

شائستہ یوسف

نظر میں یادوں کے منظر سمیٹ کر رکھنا
میں جیسا چھوڑ کے آئی ہوں ویسا گھر رکھنا

ہم نے یہ سوچ کے چھیڑا تھا فسانہ گل کا
اس بہانے ہی ترے ذکر کا پہلو نکلے

ملکہ نسیم

خود زندگی کا حسن دیا آرزو بھی دی
پھر اس کے بعد خوف قضا دے گیا مجھے

ہانی سراب ہے یہ جہان ہزار رنگ
ہر رنگ عارضی ہے کوئی معتبر نہیں

ام ہانی

نقش محرومی تقدیر کو تدبیر میں رکھ
سعی امکاں سے گزر شوق کو تعمیر میں رکھ

ٹوٹ جاتے ہیں بکھرنے نہیں دیتے خود کو
ہم نے ماؤں سے وراثت ہی عجب پائی ہے

نسیم سید

پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی ان ہونٹوں کا سایہ دیکھوں

اداس شب میں کڑی دوپہر کے لمحوں میں
کوئی چراغ کوئی صورت گلاب اترے

پروین شاکر

میں قطرے میں سمندر دیکھتی ہوں
پس منظر بھی منظر دیکھتی ہوں

بڑی وسعت ہے ہر ذرے میں پنہاں
تو پھر خود میں سمٹ کر دیکھتی ہوں

سکینہ ساجد پنہاں

ساجدہ زیدی

انسانی شخصیت

(ایک اساسی مضمون)

شخصیت کی تعبیریں

انسانی شخصیت کی مقناطیسیت کا راز کیا ہے کہ یہ مختلف علوم کے ماہرین اور محقق کے لیے ہمیشہ سے ایک دلکش اور دلچسپ موضوع رہی ہے۔ مذہب، دینیات، فلسفہ، نفسیات، شاعری، ڈرامہ، ناول اور علم الانسان غرض انسانی علوم کی کون سی شاخ ایسی ہے، جس کے ماہرین نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی حدود میں شخصیت کی نوعیت کو سمجھنے، اس کے تعینات پر غور کرنے، اس کے عناصر کو دریافت کرنے اور اس کی حدود، گہرائی اور گیرائی کا احاطہ کرنے کی مسلسل کوششیں نہ کی ہوں۔ اگر فن شاعری و مصوری پر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ابدالآباد سے ہی اپنی یہ تلاش جاری رکھی ہے یعنی خود اپنی ذات (یا ذات انسانی) کو موضوع بنا کر اس کے مخفی گوشوں تک رسائی کرنے کی کاوشیں تقریباً ہر زمانے اور ہر کلچر میں اس کا مطمح نظر رہی ہیں۔ ان میں سے کم و بیش ہر علم کے ماہرین نے اپنے مخصوص دائرہ کار میں رہ کر شخصیت کے بڑے جامع اور مربوط، بہت گہرے اور دوررس تصورات پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

مختلف مذاہب نے شخصیت کی جو تشریحات پیش کی ہیں ان کی نوعیت اگرچہ بنیادی طور پر یا اخلاقیاتی ہے یا مثالی لیکن بہ ایں ہمہ ان کے دائرہ فہم کی بنا پر اکثر و بیشتر شخصیت کے دوسرے پہلو بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ مذہب کی دوسری دین، انسانی کردار و شخصیت کے لیے مثالی نمونوں کی پیشکش ہے۔ فلسفیوں نے شخصیت کی اخلاقیاتی، عینی، سماجی، عملیاتی، فطری، مارکسی، حقیقت پسندانہ اور وجودی (وغیرہ) جیسی مختلف النوع تعریفیں پیش کی ہیں او رہر زاویہ سے انسانی شخصیت کو پرکھنے کی اور اس کی اقدار، اس کے افکار و اعمال کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کی مسلسل کوششیں کی ہیں جن کے نتیجہ کے طور پر انسانی شخصیت کے بارے میں ہمارا علم ہر چند کے حرف آخر نہ ہو، مگر رنگا رنگ اور متنوع ہو گیا ہے۔ اگر ہم مختلف فلسفوں مثلاً عینیت، حقیقت پسندی، فطرتیت، مارکسزم اور وجودیت وغیرہ کی (Ontology) یا نظریۂ حقیقت کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو شاید اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انسانی شخصیت کے مشاہدے اور اس کی حقیقت کے مطالعہ کو کسی فلسفہ نے نظر انداز نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس کے راز سربستہ پر سے پردہ ہٹانے کی سعی میں کسی قسم کی کوتاہی کی ہے۔ اس کے برخلاف ہر فلسفے نے انسانی ایگو، اس کی ذات یا اس کی شخصیت کی تفہیم کے ذیل میں، یا پھر انسان کے اس دنیا میں منصب و مقصد کے بیان میں دراصل ان رازہائے سربستہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جو ہمیں مجموعی انسانی شخصیت کا ادراک بخشتے ہیں اور اس کے کردار و عمل کے پیمانوں تک ہماری رسائی کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

مذہب و فلسفہ کے علاوہ، فنون لطیفہ، خصوصاً ادب شاعری کا مطالعہ (اور اس میں مشرق و مغرب دونوں کے ادب، شاعری شامل ہیں) ایک طرف تو انسانی شخصیت کے متعلق فہم و ادراک کا ایک لامحدود خزانہ ہمیں مہیا کرتا ہے اور دوسری طرف ہمارے تحیر و تجسس کو مہمیز کر کے ہمیں ایک ایسے

راستہ پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں سے واپس جانا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شاعر، ناول نویس وجدانی اور پیش شعوری طور پر انسانی زندگی اور اس کی ذات کے ایسے متضاد پہلوؤں سے شناسائی حاصل کر لیتے ہیں جن تک تجزیہ و تنقید اور نفسیاتی تعبیر کی نگاہیں بہت دیر میں پہنچتی ہیں۔ اگر ناولوں نے ہمیں ہیملٹ، ایلوموف، فالسٹاف پرنس مشکن، البوشا اور آنا کیرینیا جیسے کثیر العباد، لازوال کردار دیے ہیں جن کی مدد سے انسانی شخصیت کے مخفی گوشوں اور انسانی لاشعور کے نہاخانوں کی ایک جھلک بھی ہمارے سات طبق روشن کر دیتی ہے۔ تو شاعری نے اپنی ساحرانہ قوت سے انسانی شخصیت کے بنیادی تضادات کو ہمارے ادراک کا حصہ بنایا ہے اور ان شاعرانہ تجربات کے وسیلے سے ہمیں ذہن کی ایسی دنیاؤں کا سفر کرایا ہے، جہاں عقلی منطق کی رو سے ہماری رسائی ممکن نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب غالب یہ کہتے ہیں:

وان وہ غرور عزو ناز، یاں یہ حجاب پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟

1۔ ہیملٹ: شیکسپیئر کا ڈرامہ ہیملٹ کا بنیادی کردار
آبلوموف: اسی نام کے روسی ناول کا مرکزی کردار۔ از گون چاروف
فالسٹاف: شیکسپیئر کے ڈرامے۔ کا ایک مزاحیہ کردار
پرنس مشکن: دستیووسکی کے ناول ''ایڈیٹ'' کا مرکزی کردار
2۔ آنا کیرینیا: تالستائی کے اسی نام کے ناول کی ہیروئن

تو ہم ان کے حجاب پاس وضع' کو انسانی شخصیت کے وصفِ اعلیٰ۔ خودداری کے طور پر سراہتے ہیں لیکن جب وہی 'راہ میں حجاب پاس وضع' کی بنیاد پر نہ ملنے والے غالب یہ کہتے ہیں:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

تو ہم اسی بے ساختگی اور والہانہ پن سے اس انکساری اور تڑپ بلکہ 'خود سردگی کے جذبہ عظیم' کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ جس کے بنا پر غالب محبوب کے در پر دائم پڑے رہنے کے لیے بے تاب ہیں بلکہ اپنی وارفتگی میں ایسی زندگی پر خاک ڈالتے ہیں جو محبوب کا 'سنگ در' بھی نہیں یہ شاعری کا سحر اور شاعرانہ آگہی کی جادوئی تاثیر نہیں تو اور کیا ہے۔ جس نے دونوں صورتوں میں ہمیں نہ صرف شاعر کا ہم نوا بنایا، بلکہ اس کی آگہی نے ہمیں ایسا مسحور کر دیا کہ ہم بغیر چون و چرا کے ایسے ایسے بیانات کو قبول کرتے چلے گئے جو عقلی منطق کی رو سے قول محال (Paradox) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی مثالیں غالب اور دوسرے شاعروں کے یہاں بے شمار مل سکتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور مثال میں اقبال کے دو شعروں سے بھی دینا چاہوں گی۔ ایک جگہ اقبال 'مرد مومن' (مثالی شخصیت) کے بیان میں کہتے نظر آتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں، کارکشا کارساز

یعنی اس مثالی شخصیت میں غالب آنے (یا قوت کی) اور کارکشا و کارساز ہونے کی صلاحیت اسی طرح ہے۔ جس طرح اس کے خالق یعنی خدا میں ہے کہ اس کا ہاتھ خود اللہ کا ہاتھ ہے اور انھیں یہ صفات دل پذیر اور ناگزیر نظر آتی ہیں۔

ایک اور موقع پر یہی اقبال کہتے ہیں کہ:

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اور ہمارے لیے شخصیت مثالی کی یہ صفت بھی جو بظاہر پہلے شعر کا تضاد ہے اتنی ہی دلکش ہے اور دلفریب، اور شخصیت کی تکمیل کے لیے اتنی ہی ضروری معلوم ہوتی ہے جتنی کہ کار آفرینی اور کشائی کی صفات، کیونکہ شاعر کے ساتھ ہم خود بھی ایک پیش شعوری عمل کے وسیلے سے انسانی شخصیت کے ان تضادات کا عرفان حاصل کر لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ شعوری طور پر ہمارا ان تضادات کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا تو ہونا ہی چاہیے، یہ تو ہوتا ہی ہے اور اگر یہ دو رخیت نہ ہو تو انسانی شخصیت پھیکی اور بے رس ہو جائے گی۔ ہم ان گتھیوں کو عقلی منطق یا نفسیاتی دلائل سے سلجھانا نہیں چاہتے، بلکہ ان کا براہ راست و بلا واسطہ ادراک کرتے ہیں، کیونکہ ان کی سحر آفرینی سے فہم و ادراک کے جو دروازے ہمارے سامنے خود بخود کھل جاتے ہیں وہ ہماری آگہی میں غیر محسوس اضافہ کرتے ہیں۔

اس نسبتاً طویل مثال سے میرا مقصد اس بات کی وضاحت کرنا تھا کہ:

(1) شخصیت کی افہام و تفہیم کے لیے نفسیات کے علاوہ اور بھی دروازے ہمارے سامنے کھلتے ہیں جن میں سے بعض انکشافات اپنی ساحرانہ تاثیر کی وجہ سے از خود ہمارے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اور (2) یہ کہ انسانی شخصیت ایک ایسی پیچیدہ اکائی ہے جس میں تضادات کی کارفرمائی ہے اور جس کے مطالعہ میں ہمیں قدم قدم پر تضادات کے جوڑوں یا متضاد عناصر کی باہم دگر آمیزش اور آویزش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ (3) یہ کہ بعض اوقات ہم فلسفہ، ونفسیات، دلیلوں اور تجربوں سے وہ گتھیاں حل نہیں کر سکتے جو شعر و ادب وجدانی طریقوں سے کر دیتے ہیں، جن کے پس منظر میں تخلیقی جست کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اچھائی برائی، بڑی کمتری یا حسن و قبح

وغیرہ کے پہلو مضمر نہیں ہوتے۔ جدید نفسیات نے اس لفظ کو معروضی مفہوم دینے کی جو قابل قدر کوششیں کی ہیں، ان ہی کی بدولت شخصیت کی نفسیات جیسے پیچیدہ علم کی اس حد تک نشو ونما ہوئی ہے۔ بہ ایں ہمہ شخصیت کے صرف نفسیاتی تشریح کے نقطۂ نظر سے بھی مختلف نظریات ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہر دور میں اور ہر مکتبِ فکر کے ماہرین نفسیات نے شخصیت کی نفسیات دریافت کرنے کی کوششیں کی ہیں اور اپنے اپنے مکاتب فکر کی روشنی میں شخصیت کے نظریات مرتب کیے ہیں۔ جن میں سے کچھ بہت اہم، زیادہ رائج، مقبول عام اور باریک بین نظریوں کا انتخاب اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

نفسیاتی پہلو پر غور کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں، ان مفاہیم کا جائزہ لینا چاہیے جو فلسفہ اور سماجیات میں شخصیت کی اصطلاح کے لیے رائج ہیں۔

شخصیت کے مذہبی اور فلسفیانہ تصورات

ابتدائی دینیات کی رو سے شخصیت کا تعلق فرد کے اصل جوہر سے تھا۔ بعد میں علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ فلسفے نے جو تعریفیں مرتب کیں ان پر بھی دینیاتی نقطۂ نظر کا اثر نمایاں تھا۔

سینٹ تھومس نے 'شخص' کو فطرت کی ہر حقیقت سے برتر قرار دیا۔ کیونکہ فرد شعور اور انفرادیت کے امکانات سے نوازا گیا ہے۔ ارسطو کا عقیدہ تھا کہ فرد کا وجود نسل انسانی کی بہبودی کے لیے ہے۔ رفتہ رفتہ شخصیت میں اس عقیدہ کی جگہ فرد کی ذات کی اہمیت یا انسان کی انفرادیت نے لے لی۔ بعد میں اسی فرد — مرکز نظریے کے بطن سے رومانیت اور شخصی اخلاقیات کے تصور نے جنم لیا ہے۔

کرسچن ولف نے شخصیت کے تصور میں شعور ذات اور حافظے کی قوت پر زور دیا اور لے بینز نے شخص کو فہم وادراک کا حامل مادہ قرار دیا۔ لوگ نے شخص کی تعریف اس طرح کی:

'وہ ایک ذہین اور فہیم ہستی ہے جو عقل اور غور وفکر پر قادر ہے اور اپنی ذات کا شعور رکھنے کی اہل ہے۔'

شخصیت کا مفہوم

بہرحال یہ سب تو شخصیت کی مختلف انسانی علوم کے ضمن میں تعبیریں ہیں لیکن اگر شخصیت کا باضابطہ اور سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے (جو فی زمانہ ناگزیر ہے) تو سب سے پہلے تو یہ غور طلب مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نفسیات کو سمجھنے اور اس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنے سے قبل اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جس حد تک ممکن ہو سکے اس کے نفسیاتی مفہوم کا معروضی تعین کیا جائے اور مختلف النوع حقائق کے پیش نظر اس کی ایسی جامع تعریف اخذ کی جائے جو شخصیت میں شامل گوناگوں عناصر اور پیچیدہ عوامل کا احاطہ کر سکے۔

"لفظ شخصیت جس کا انگریزی ترجمہ پرپرسنیلٹی(Personality) ہے لاطینی لفظ پرسونا(Persona)سے ماخوذ ہے۔ پرسونا کا مطلب ماسک ہے یعنی وہ نقلی چہرہ جو رومن تہذیب کے عروج کے دور میں ڈرامہ کے ایکٹر اپنے چہرہ پر لگا لیتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ لفظ ظاہراً خدوخال اور حرکات وسکنات کے لیے مستعمل تھا۔ چنانچہ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ آج تک یہ لفظ پرسنیلٹی انگریزی ، اردو، ہندی اور بھی کئی زبانوں میں ظاہرہ خدوخال، قد و قامت اور حسن و صحت وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم اکثر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی پرسنیلٹی اچھی ہے یا بری ہے ۔ بارعب ہے یا فدوی قسم کی ہے ۔ حالانکہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ بیانات کلی طور پر صحیح نہیں ہیں. کیونکہ شخصیت ایک معروضی تصور ہے یہ اور بات ہے کہ بعض ماہرین نفسیات نے یہ تسلیم کیا ہے کہ زندگی اور ڈرامے میں اور فرد، کردار اور ایکٹر میں جو اندرونی مناسبت ہے اس کی رو سے یہ ماخذ جائزہ معلوم ہوتا ہے۔"

اس مقصد کے لیے شخصیت کے بارے میں مروج ان چند فلسفیانہ، سماجی، نفسیاتی اور عوامی نقطہ ہائے نظر کا سرسری جائزہ لینا چاہیے۔ جن کے سیاق وسباق میں شخصیت کے مختلف نظریات کو بہتر طور پر سمجھنے کا امکان پیدا ہوسکتا ہے۔

لفظ شخصیت جس کا انگریزی ترجمہ پرپرسنیلٹی (Personality) ہے لاطینی لفظ پرسونا (Persona) سے ماخوذ ہے۔ پرسونا کا مطلب ماسک ہے یعنی وہ نقلی چہرہ جو رومن تہذیب کے عروج کے دور میں ڈرامہ کے ایکٹر

اپنے چہرہ پر لگا لیتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ لفظ ظاہراً خدوخال اور حرکات وسکنات کے لیے مستعمل تھا۔ چنانچہ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ آج تک یہ لفظ پرسنلیٹی انگریزی، اردو، ہندی اور بھی کئی زبانوں میں ظاہرہ خدوخال، قدوقامت اور حسن وصحت وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم اکثر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی پرسنیلٹی اچھی ہے یا بری ہے۔ بارعب ہے یا فدوی قسم کی ہے۔ حالانکہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ بیانات کلی طور پر صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ شخصیت ایک معروضی تصور ہے یہ اور بات ہے کہ بعض ماہرین نفسیات نے یہ تسلیم کیا ہے کہ زندگی اور ڈرامے میں اور فرد، کردار اور ایکٹر میں جو اندرونی مناسبت ہے اس کی رو سے یہ ماخذ جائزہ معلوم ہوتا ہے۔

شخصیت نفسیات کی رو سے ایک معروضی حیثیت رکھنے والا لفظ ہے،

جس میں

ویکرٹ کے نظریے کی رو سے، شخصیت اصل جوہر ہے جو ایک ناقابل تقسیم مرکز ہے اور انسانی شخصیت میں تبدیلیاں محض بیرونی سطح پر ہوتی ہیں۔' ویکرٹ کا تصور شخصیت لوک سے بھی زیادہ ماورائی قسم کا ہے۔

یہ جملہ تعریفیں جو شخصیت میں، عقلیت، شعورِ ذات اور انسانی ذات کے، موضوعی مرکز، پر زور دیتی ہیں، شخصیت اور ذات کو بڑی حد تک ہم معنی تسلیم کرتی ہیں۔

رومانیت کی تحریک کے زیر اثر بھی، شخصیت کو آئیڈیل کے مترادف سمجھا جانے لگا تھا۔ نطشے نے شخصیت کی باطنی صداقت کو قدرِ اولی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور گوئٹے نے خود شخصیت کو قدرِ اول کہا ہے۔ کانٹ کے نظریے کے مطابق تمام مخلوقات عالم انسان کی قوت کے تابع ہیں اور اس کے تصرف کے لیے ہیں سوائے ایک مخلوق کے جو خود انسان کی ذات ہے۔ اقبال نے اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی انسانی شخصیت کا یہی آخر الذکر تصور پیش کیا ہے:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اس کا سیاق وسباق آدم کے جنت سے نکالے جانے کا واقعہ ہے جب، روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے (اقبال کے الفاظ میں) کانٹ کے قول کے مطابق، انسان عاقل ہے لہٰذا وہ ذریعہ نہیں ہے بلکہ اپنا مقصد آپ ہے۔ وہ صرف اخلاقی قانون کے تابع ہے اور اپنی انفرادی آزادی کی بنا پر تمام مخلوقاتِ عالم سے برتر ہے۔ اثباتِ ذات کا وہ اخلاقی نظریہ، جس کی رو سے انفرادی شخصیت کی نشوونما کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ دراصل کانٹ کی ہی دین ہے۔ اقبال اپنے اس شعر میں:

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

کانٹ سے بھی ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں اور انسانی ذات کو مقصد تخلیق کائنات کی حیثیت دے دیتے ہیں کہ وہ خود 'رازِ کن فکاں' ہے۔

ایڈلر کا کہنا ہے کہ...... 'شخصیت انسان کے اندر اس کیفیت کا نام ہے جو اسے فی نفسہٖ قابل قدر بناتی ہے، قطع نظر اس امر کے کہ اپنی نوع انسان کے لیے شخص کی اہمیت کیا ہے'......

مندرجہ بالا بیانات کے خلاصے کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شخصیت کے زیادہ تر نظریات (فلسفیانہ اور مذہبی) ان امور پر متفق ہیں۔

......کہ شخصیت قدرِ اول ہے۔

......کہ 'اشخاص' کو مابعد الطبعیاتی طور پر' چیزوں سے ممتاز کرنا چاہیے۔

......کہ شعور، اثبات اور انفرادی آزادی موضوعی تجربے کے وہ تکوین ہیں جو شخصیت کو قابل قدر بناتے ہیں۔

......کہ انسانی زندگی کا مقصد اول شخصیت کی بالیدگی اور اثبات ہے......

اس نسبتاً طویل تمہید سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذہب اور فلسفہ کی رو سے انسانی شخصیت یا ذاتِ انسانی (ان دو تصورات کو ان علوم نے عموماً ہم معنی کے طور پر استعمال کیا ہے) ایک کل ہے ایک نامیاتی اکائی ہے، جس کا صحیح ادراک بحیثیت کلی کیا جاسکتا ہے اور جس کی تعبیر کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی عنصر یا جوہر یا روح یا نفس بالا پر اپنی نظروں کو مرتکز کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم نے شخصیت کی تعبیر کے لیے اسے اجزا میں تقسیم کر کے ان کا تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا بلکہ شخصیت انسانی کا، بحیثیت کلی ادراک کیا ہے اس کے مرکزی جوہر کی طرف توجہ دی ہے اور اس کی شعوری و اختیاری، حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے۔

(ماخوذ: شخصیت کے نظریات، ساجدہ زیدی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن 1999)

□□□

جہانِ نسواں

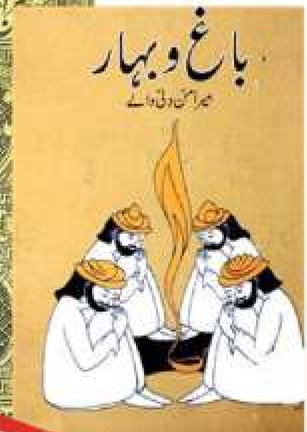

عشرت جہاں

اردو کا داستانوی ادب

ایک مطالعہ

اردو زبان میں داستانوں کو مقبولیت حاصل رہی ہے، اس لیے اردو کے بلند پایہ مصنفین نے ناول سے پہلے داستان لکھنے پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اگر زمانہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو میں داستانوں کا زمانہ دو صدیوں سے زائد عرصے پر محیط رہا ہے۔ ملاوجہی کی ''سب رس'' 36-1635 میں لکھے جانے کے بعد مولوی نذیر احمد کے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' (1869) تک کا زمانہ داستانوں کا ہی زمانہ تھا۔ کیونکہ مولوی نذیر احمد کو اردو کا باضابطہ پہلا اردو ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ گویا کہ مراۃ العروس کے بعد ناول کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

دو سو سال سے زائد عرصے میں مجموعی طور پر کتنی داستانیں لکھی گئیں۔ اس کی صحیح تعداد تو پیش کرنا مشکل ہے، البتہ زمانہ کی طوالت اور داستان گوئی و داستان نویسی کے رواج سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ اردو میں لکھی گئی داستانوں کی تعداد یقیناً کافی زیادہ ہوگی۔ جن داستانوں نے زبردست شہرت و مقبولیت حاصل کی اور آج بھی حلقۂ ادب میں جن کا چرچا ہے، ان کی تعداد بھی درجنوں ہے۔ 'سب رس'، 'نوطرز مرصع'، 'داستان امیر حمزہ'، 'الف لیلہٰ'، 'آرائش محفل'، 'باغ و بہار'، 'بوستان خیال'، 'فسانہ عجائب'، 'عجائب القصص'، 'گل بکاؤلی' اور 'گل صنوبر' جیسی داستانیں اردو فکشن کا وہ عظیم سرمایہ ہیں جن پر اردو ادب آج بھی نازاں ہے۔ ان داستانوں کے غائرانہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے توسط سے اردو زبان کو کس درجہ فروغ حاصل ہوا۔ اردو کے بعض داستان نویسوں نے اردو زبان کو عام فہم بنانے اور اسے طبقۂ عام میں رواج دینے کا بھی عظیم کارنامہ انجام دیا۔ اس کا اندازہ میر امن کی 'باغ و بہار' اور حیدر بخش حیدری کی 'آرائش محفل' کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ میر امن نے تو 'نوطرز مرصع' جو زبان و بیان کے اعتبار سے مشکل تھی، کو 'باغ و بہار' کی شکل میں آسان کیا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد زیادہ تر مصنفین نے عموماً آسان تحریریں لکھنی شروع کردیں۔

مذکورہ اردو داستانوں سے اس دور کی تہذیب اور رواج اور رسوم و روایات کا بھی پتہ چلتا ہے، نیز اس زمانہ کے لوگوں کے مذاق و مزاج اور خیالات و نظریات بھی سامنے آتے ہیں، گویا کہ اردو کا داستانوی ادب ناول و افسانہ کے ادوار سے پہلے کی کئی صدیوں کا فکشن ہے۔ ان داستانوں میں مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی بھی بھرمار ہے، اگرچہ موجودہ سائنٹفک دور میں جنّات، پری، دیو اور اس قبیل کے نرے خیالی کرداروں کے لیے جگہ نہیں ہے، مگر اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے جب آج کی طرح سائنسی ترقی، ایجادات و مصنوعات کا وجود تو درکنار، تصور تک نہ تھا اور زندگی بہت محدود تھی، تب عوام الناس کے درمیان مافوق الفطرت خیالات و واقعات کا بڑا شہرہ تھا۔ بہت سے لوگ ان میں یقین رکھتے تھے اور بہت سے انھیں دلچسپی کا ذریعہ خیال کرتے تھے، داستان گو بھی اپنے زمانہ کے مزاج کو داستانوں میں پورے زور و شور کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ یہ سب کچھ اردو زبان میں ہی نہیں بلکہ عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر زبانوں کی داستانوں میں بھی پایا جاتا تھا۔

اردو میں بعض داستانیں طبع زاد ہیں، بعض ترجمہ اور بعض دوسری زبانوں کی داستانوں سے اخذ کردہ۔ مشہور داستانوں میں ایسی داستانوں کی تعداد خاصی ہے جو دوسری زبانوں سے براہ راست ترجمہ کی گئیں یا

دوسری زبانوں سے لی گئیں یا ان کے خیالات سے استفادہ کر کے لکھی گئیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترجمہ یا دوسری زبانوں سے اخذ کی گئی داستانوں کی اہمیت طبع زاد داستانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ داستانیں خواہ ترجمہ ہوں یا طبع زاد، وہ اپنی خصوصیت، زبان واسلوب اور کرداروں کے سبب اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ذیل میں اردو کی بعض اہم داستانوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

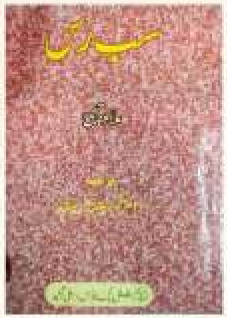

''سب رس'' ملاوجہی کی تصنیف ہے جو 1045ھ، مطابق 36-1635 میں لکھی گئی۔ اس کے بارے میں ملاوجہی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ان کی اپنی طبع زاد تصنیف ہے مگر محققین نے ان کے اس دعویٰ سے اختلاف کیا ہے اور اسے فتاحی نیشاپوری کے قصے 'حسن ودل' سے ماخوذ بتایا ہے۔ اس داستان کو اس لیے نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ یہ سترھویں صدی کی سب سے اہم داستان ہے، بلکہ اسے اردو کی پہلی داستان بھی کہا گیا ہے۔ اس داستان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ تمثیلی پیرائے میں لکھی گئی ہے۔

''سب رس'' کے بعد دوسری اہم داستان 'نوطرز مرصع'' ہے جس کا سن تصنیف 1775 بیان کیا جاتا ہے۔ یہ داستان بھی طبع زاد نہیں ہے۔ کیونکہ اسے فارسی قصہ 'چہار درویش' سے لیا گیا ہے۔ اسے میر محمد عطا حسین تحسین نے تصنیف کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تحسین جنرل اسمتھ کے ساتھ کشتی کے ذریعہ گنگا کے راستے کلکتہ جا رہے تھے، جنرل اسمتھ کے ساتھیوں میں سے ایک نے سفر کٹنے کی آسانی کے مقصد سے یہ قصہ سنایا، تحسین بھی اسے سن رہے تھے، ان کے دل میں خیال ہوا کہ اسے اردو میں تحریری شکل میں پیش کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ بعد میں انھوں نے اسے قلم بند کیا اور اس کا نام 'نوطرز مرصع' رکھا۔ ''نوطرز مرصع'' کی زبان مشکل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ انھوں نے عربی فارسی کے بہت سے الفاظ، محاورے، اور ضرب الامثال استعمال کی ہیں۔ 18 ہویں صدی عیسوی کی داستانوں میں کوئی بھی داستان اس کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکی بلکہ بعد کی داستانوں میں بھی اس کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اردو کی اہم داستانوں میں ایک داستان 'امیر حمزہ' ہے۔ یہ فورٹ ولیم کالج کے تحت جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر خلیل علی خاں اشک کے ذریعہ 1801 میں لکھی گئی۔ بنیادی طور پر یہ داستان فارسی داستان کا ترجمہ ہے۔ بعض نے اسے عربی داستان بتایا ہے مگر یہ درست نہیں۔ داستان ''امیر حمزہ'' میں امیر حمزہ مراد نہیں بلکہ حمزہ بن عبداللہ مراد ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں تھے، ان کے بہادرانہ کارناموں کو اس داستان میں پیش کیا گیا ہے۔

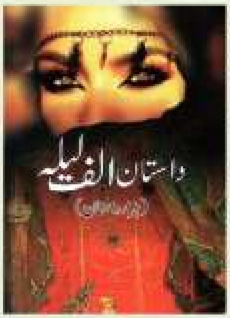

'الف لیلہ' بھی اردو کے نثری ادب میں ایک خاص اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک طویل قصہ جو قریب دوسوطویل کہانیوں پر مشتمل ہے۔ 'الف لیلہ' کی کہانی اس طرح ہے کہ ایران میں ایک بادشاہ تھا جو جس عورت سے شادی کرتا، صبح اسے قتل کروا دیتا۔ اسی اثنا میں ایک ایسی عورت سے اس کی شادی ہوئی جس نے اپنی اور دوسری عورتوں کی جان بچانے کے لیے طویل قصہ سنانا شروع کردیا۔ یہ قصہ ایک ہزار راتوں میں پورا ہوا۔ اسی مناسبت سے اسے 'الف لیلہ' کہا گیا۔ عربی میں 'الف' کے معنی ہزار کے اور 'لیلہ' کے معنی رات کے آتے ہیں۔ فارسی میں یہ کہانیاں 'ہزار فسانہ' کے نام سے مشہور ہیں۔ اس قصے کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ عرب کی کہانی ہے اور بعض نے اس کی اصل فارسی قصہ کو بتایا ہے جب کہ بعض محققین کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ ہندوستانی کہانی ہے جو یہاں سے ایران پہنچی، اس کے بعد وہاں سے عرب گئی اور 1704 میں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔

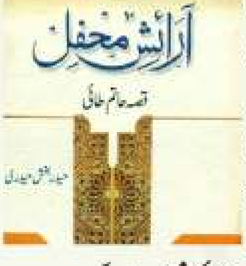

''آرائش محفل'' اردو کی وہ داستان ہے جسے فورٹ ولیم کالج کے تحت حیدر بخش حیدری نے اردو میں منتقل کیا۔ فارسی میں یہ قصہ 'ہفت سیر حاتم' کے نام سے لکھا گیا ہے۔ 'آرائش محفل' ترجمہ ہے یا حیدری نے اپنے طور پر بھی اس میں کچھ حشو وزوائد سے کام لیا ہے۔ اس بابت فاروق ارگلی مقدمہ آرائش محفل میں لکھتے ہیں:

''لیکن اردو 'آرائش محفل' کو محض ترجمہ قرار دینا درست نہیں کیوں کہ اس میں حیدری نے اپنی جودت طبع اور پرواز تخیل

کو کام میں لاتے ہوئے مزید دلچسپیاں، واقعات اور ذیلی کردار شامل کیے ہیں''۔ (آرائش محفل جدید ایڈیشن،ص:4)

آرائش محفل کی زبان سادہ اور سلیس ہے، مصنف نے اس کی عبارت کو پیچیدگی سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ درج ذیل اقتباس سے آرائش محفل کی زبان، سادگی اور سلاست کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''حاتم نے ایک مہرہ اپنی پگڑی سے کھولا اور پانی میں ڈال کر اس کی آنکھوں سے لگادیا، اس نے وہیں شفا پائی اور اسی گھڑی درد جاتا رہا، اسی صورت سے اس نے دو تین بار لگایا، وہ کٹوراسی کھل گئیں اور پانی بند ہوگیا اور دیوں کا سردار بہت خوش ہوا اور خدمت اس کی بہت سی کی''۔

(آرائش محفل، جدید ایڈیشن، ص:63)

اس قصہ میں حاتم کو نہایت نیک انسان دکھایا گیا ہے جو سات سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کے لیے نکلتا ہے اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرتا ہے مگر بعض مقامات پر اس داستان میں کردار کی کمزوری بھی نظر آتی ہے۔ بہرکیف اردو زبان میں یہ داستان اپنی الگ اہمیت رکھتی ہے۔

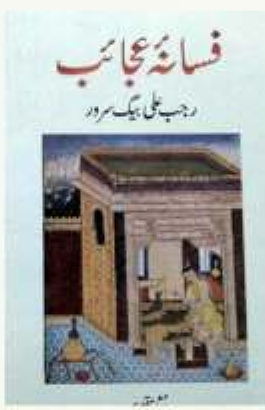

'آرائش محفل' کے فقط ایک سال کے بعد فورٹ ولیم کالج کے تحت لکھی جانے والی میر امن کی 'باغ وبہار' نے تو اردو دنیا میں ایک کہرام مچا ڈالا حالانکہ تحسین بہت پہلے اس داستان کو 'نوطرز مرصع' میں پیش کر چکے تھے مگر میر امن نے جس انداز سے اس کو پیش کیا، اس کی ایک الگ حیثیت سامنے آئی۔ میر امن نے جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر پہلے تو اس کی زبان کے عام فہم ہونے پر توجہ دی، اس کے بعد داستان کے تمام گوشوں پر غائر نگاہ رکھی، ناقدین نے اسے ہر اعتبار سے سراہا اور تنقید کی کسوٹی پر بہتر قرار دیا۔ اس داستان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ جہاں اس میں قدیم داستانوی اسلوب پیش کیا گیا، وہیں یہ آنے والے زمانے کے افسانوی ادب کے لیے بھی ایک تمہید بن گئی۔ ڈاکٹر سنبل نگار کے مطابق:

''اردو نثر کی تاریخ میں باغ وبہار کو بے مثال اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں مختصر افسانے کا جنم تو بعد میں ہوا لیکن باغ وبہار میں پہلی بار افسانے کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے''۔

(اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، از: ڈاکٹر سنبل نگار، ص:65)

اردو کے داستانوی ادب میں 'فسانہ عجائب' کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ قصہ اردو کے افسانوی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اردو کی پہلی داستان ہے جسے باضابطہ طبع زاد کہا گیا۔ رجب علی بیگ سرور نے اسے 1824 میں تصنیف کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب سرور نے باغ وبہار کے جواب میں لکھی۔ دراصل رجب علی بیگ سُرور اتنی عام فہم اردو کے قائل نہ تھے جتنی باغ و بہار میں لکھی گئی، اسی لیے سرور نے اس میں بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار کی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سارا زور عبارت آرائی، پرشکوہ الفاظ اور مشکل تعبیرات کو داستان کی خصوصیات کے طور پر قلمبند کیا لیکن یہی سب چیزیں اس قصہ کی کمزوری کہلائیں اور ناقدین نے انھیں پسند نہیں کیا۔ اس کے باوجود 'فسانہ عجائب' کی اپنی اہمیت ومقام ہے، جیسا کہ رشید حسن نے 'فسانہ عجائب' میں مقدمہ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آج اس کتاب کے متعلق تاریخی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے جو رائے بھی ظاہر کریں اور اس پر جس قدر اعتراض کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتاب سامنے آئی تھی اس زمانے میں یکتائی کی دھوم مچ گئی تھی اور بہت جلد اس کو دبستان لکھنؤ کی نمائندہ تصنیف کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا''۔

(فسانہ عجائب، از: رجب علی بیگ سرور، مرتب: رشید حسن خاں، ص:3)

اردو کے داستانوی ادب میں اور بھی متعدد ایسی داستانیں ہیں جن کو ادب میں عظیم مقام حاصل ہوا، اس مختصر سے مضمون میں سبھی داستانوں پر گفتگو مشکل امر ہے، بہرکیف مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو فکشن میں داستانوی ادب ایک گراں قدر اثاثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

□□□

Ishrat Jahan
Mohalla Tandola
Tanda
Rampur-244925 (U.P)

راشدالخیری کا نظریۂ تعلیم نسواں

زیب النساء

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور انقلاب 1857 کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی سماجی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انگریزوں کے تسلط اور غلبہ کی وجہ سے شکست خوردہ ہندوستانیوں خاص طور سے مسلم اقوام میں پست ہمتی پیدا ہوئی اور نفسیاتی طور پر وہ دن بہ دن کمزور ہوتے چلے گئے اور تنزلی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر یہ قوم اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی، نتیجتاً زندگی کے ہر شعبے پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ ایسی سنگین صورت حال میں سرسید نے یہ محسوس کیا کہ اس بدلی ہوئی صورت حال میں وقت کے تقاضے اور مطالبے کے پیش نظر درپیش چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنا ہوگا۔ انھیں یہ اندازہ تھا کہ مسلمان تعلیمی اور معاشی اعتبار سے سب سے زیادہ پستی میں ہیں۔ لہٰذا تعلیم کے ذریعے ہی مسلمانوں کی پس ماندگی دور ہو سکتی ہے اور وہ احساس کمتری کے حصار سے باہر نکل سکتے ہیں لیکن اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ صرف جدید تعلیم حاصل کرنے کا ہی نہیں تھا بلکہ تعلیم سے عام بیزاری کو بھی دور کرنا تھا، اس لیے انھوں نے عصری تعلیم کی طرف توجہ کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک کی شروعات کی اور انھی منصوبوں نے ملک کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکات میں اہم رول ادا کیا۔

سرسید احمد خاں نے ملک کی معاشرتی اور تعلیمی زندگی میں اہم کردار ادا کیا لیکن بدقسمتی سے ان کوششوں میں تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کی طرف خاص توجہ نہیں دی گئی۔ جب کہ اصلاح معاشرہ کے لیے ''تعلیم مرداں'' کے ساتھ ''تعلیم نسواں'' کا ہونا از حد ضروری تھا، کیونکہ اس دور میں عورت کی اکثریت نہ صرف جاہل تھی بلکہ فرسودہ خیالات وعقائد اور جاہلانہ وباطلانہ رسم ورواج کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ سرسید کے رفقا میں سب سے پہلے نذیر احمد نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ عورتوں کو معاشرتی نظام کا ایک حصہ سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے ناولوں میں خواتین کی تعلیم وتربیت اور ان کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے بعد یہ سلسلہ حالی، سرشار، شرر اور رسوا وغیرہ سے ہوتا ہوا اس دور کے دیگر مصنفین کے ذریعے آگے بڑھتا گیا۔ راشدالخیری بھی انھیں چند لوگوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے نذیر احمد کے طرز تحریر کا تتبع کرتے ہوئے اسی روایت کی تقلید کی اور انھیں اپنا فکری وفنی رہنما بنایا۔

راشدالخیری کثیرالتصانیف قلمکار تھے۔ انھوں نے اصلاحی، معاشرتی اور تاریخی ناول، افسانے اور مختلف نوعیت کے مزاحیہ اور مذہبی مضامین کے علاوہ تاریخ وسیرت اور شاعری میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے اور ان کی تمام تر کوششوں کا محور طبقۂ اناث کی اصلاح وتربیت اور ان کے حقوق کی بازیافت تھا۔ وہ انھیں پستی سے نکال کر سماج میں بلند مقام عطا کرنا چاہتے تھے۔ عورتوں کی مظلومیت، ان کے اندر تعلیم وتربیت کا فقدان، معاشرے اور کنبے میں ان کی بے وقعتی کے وہ خود شاہد تھے۔ راشدالخیری کو ان کی محرومیوں کا احساس تھا، انھوں نے نسوانی زندگی اور ان کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا، ایک عورت کے درد وغم اور بے بسی کو ایک عورت کی نظر سے دیکھا، سمجھا، محسوس کیا اور اس کے مجموعی مسائل کو حل کرنے کے لیے تعلیم نسواں کو ضروری قرار دیا۔ کیونکہ نذیر احمد اور ان کے

ہمعصروں کے زمانے میں جوتھوڑی بہت مشرقی تہذیب کی جان باقی تھی خواتین اس بچے ہوئے سرمائے کو لے کراپنے اپنے گھروں تک مقید ہو گئیں اور بر خلاف مردوں کے کہیں زیادہ سکون کی زندگی گزارنے لگیں، لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں معاشی حالت نے اس پرسکون زندگی کو درہم برہم کرڈالا۔ مغربی تعلیم و تہذیب کی راہیں الگ الگ کرڈالیں۔ عام مدرسے کھل جانے سے گھر کے مکتب بند ہوگئے، جب کہ اس سے پہلے گھر کے مکتب ہی خواتین کی سب سے بڑی تعلیم گاہ ہوا کرتے تھے۔ گھر کے مکتب بند ہوجانے اور زمانے کی پابندیوں کی وجہ سے خواتین گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہیں نیز مردوں کی غفلت اور سماجی رکاوٹوں کے علاوہ خود ان کی تعلیم سے بدظنی ان کی جہالت کی ذمے دار تھی۔ راشدالخیری نے جب مسلمان گھرانوں کی عورتوں کی زبوں حالی کا نقشہ دیکھا تو انھوں نے اپنی پوری توجہ عورتوں کی طرف کی اوران کی روحانی، مذہبی اور اخلاقی تعلیم وتربیت اوران کے جائز حقوق کی بازیافت اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ بقول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ:

"راشدالخیری نے تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی اور مسلم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اخلاقی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اپنا موضوع بنایا تھا..... بہر طور راشدالخیری کا نام اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ راشدالخیری کے یہاں متوسط طبقے کی پیش کش میں عورت موضوع خاص ہے اور آزادی نسواں مقصد خاص، جس کے حصول کے لیے عورت کی مظلومیت کو انتہائی دردمندی کے ساتھ سامنے لائے۔"

(اردو افسانے کی روایت، ص:34)

راشدالخیری معاشی اور سماجی تعطل کو سدھارنے کے لیے ایک عورت کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ سماج کو سدھارنے کے لیے گھر سے زیادہ اہم جگہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ جس قوم کی مائیں بلند خیال، عالی ہمت، شائستہ ومہذب ہوں گی اس قوم کے بچے یقیناً اچھا معاشرہ تعمیر کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ کیونکہ ماں کی گود پہلا دبستان ہے جو انسان کو اخلاق اور شرافت کا سبق سکھاتا ہے اور آئندہ نسل کے افراد کو صحتمند اور مہذب بنانے کی تعلیم کسی بھی اعلیٰ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں بلکہ 'آغوش مادر میں ہے' جہاں زندگی کے تمام پہلوؤں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ مثلاً تربیت اولاد، عورت اور مرد کی سماجی اہمیت، ان کی ذمہ داریاں اور فرائض، بے جا رسموں کا انسداد، کفایت شعاری، سادگی اور مروت وغیرہ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی مائیں تعلیم یافتہ ہوں۔ بقول راشدالخیری:

"بچوں کا سب سے پہلا مدرسہ سمجھو، اتالیق سمجھو جو کچھ بھی ہے ماں کی ہے۔"

(صبح زندگی، ص:38)

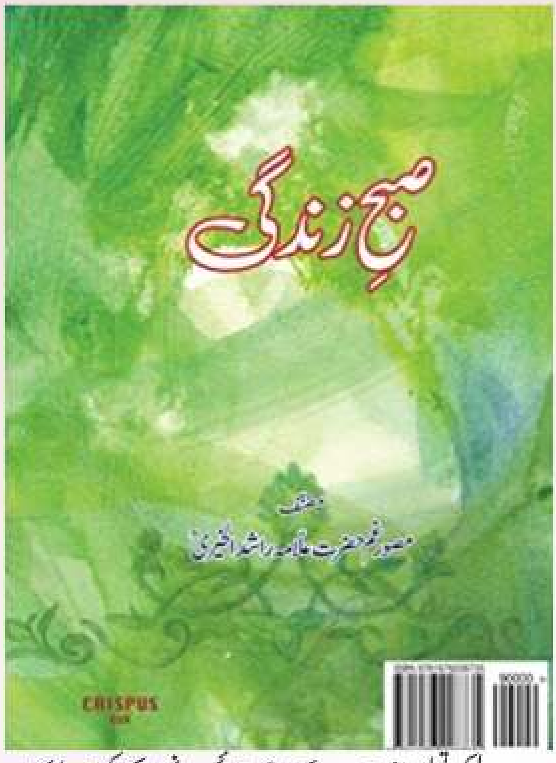

لیکن تعلیم بغیر تربیت کے اچھے نتائج پیدا نہیں کرسکتی اور لڑکیاں مستقبل میں فرض شناس بیویاں اور ذی شعور مائیں نہیں بن سکتیں۔

راشدالخیری تربیت کے سلسلے میں اس بات پر خاص طور سے زور دیتے ہیں کہ مائیں اپنے بچوں اور خاص طور سے لڑکیوں کو بداخلاق اور پست خیال لوگوں کی صحبت سے محفوظ رکھیں۔

راشدالخیری نے جہاں ایک طرف اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ عورتوں کی اصلاح وتربیت اوران کے حقوق کی بازیافت کے لیے آواز اٹھائی، وہیں عورتوں کا ایک مثالی نمونہ بھی پیش کیا۔ انھوں نے اسی آئیڈیل کو سامنے رکھتے ہوئے چھ سال سے گیارہ سال تک کی لڑکیوں کے لیے 21/فروری 1922 کو "تربیت گاہ بنات" قائم کیا تاکہ جب یہ لڑکیاں یہاں سے نکل کر عملی زندگی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں تو ایک مثالی عورت کا کردار ادا کرسکیں اور ساری زندگی عورتوں کے حقوق اور

ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف قلمی جہاد بھی کریں۔ذیل میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مسلمانوں کی بہت ساری خرابیوں کا انسداد صرف اس طرح ممکن ہے کہ بچیوں کو معقول تعلیم وتربیت دی جائے اور ایک ایسی درس گاہ قائم ہو جہاں جدت وقدامت دونوں سے استفادہ ہو اور مدرسہ کا کوئی قدم دائرہ مذہب سے باہر نہ جانے پائے۔اسی سلسلہ میں میں نے یہ عرض بھی کیا تھا کہ میں گذشتہ بیس سال کے تجربے کے بعد جس قسم کی لڑکیاں کتابوں میں پیش کر رہا ہوں قوم میں ان کی کافی دھوم دھام ہو چکی اور اب کہ میری عمر کا بڑا حصہ ختم ہو گیا۔چاہتا ہوں کہ ایسے مدرسہ کی بنیاد ڈال دوں جہاں سے میرے سامنے ہی اگر میں پانچ برس اور زندہ رہ جاؤں تو چند لڑکیاں ایسی نکل آئیں جن کو میں قوم کے واسطے مایہ ناز سمجھوں گا۔''

(عصمت،دسمبر1920)

راشدالخیری نے خواتین کی اصلاح وتربیت کے لیے افسانوی تصانیف کی طرح غیر افسانوی تحریروں کو بھی ذریعہ بنایا۔انھوں نے عصمت، سہیلی، جوہر نسواں اور تمدن وغیرہ جیسے اہم رسائل جاری کیے تا کہ عورتوں کی اصلاح وتربیت اور فکر وشعور میں مثبت اور تعمیری تبدیلی لائی جاسکے۔رسالہ عصمت کے جاری کرانے کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد عورتوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا تھا۔کیونکہ اس وقت لکھنے والیاں گنتی کی تھیں۔انھوں نے عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، اور حفظانِ صحت وغیرہ پر ان میں مضمون نگاری کا رجحان پیدا کرنے کے لیے عورتوں کے فرضی نام سے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''خواتین کے واسطے عصمت میں دینی ودنیوی دونوں قسم کی فلاح وبہبود ملحوظ ہے۔کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انھیں کیا تیاری کرنی ہے۔جو جو دقتیں انھیں پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے۔''

(عصمت،علامہ راشدالخیری نمبر1936،ص:11)

راشدالخیری نے اپنی تحریروں سے جہاں مردوں کو عورتوں کے حقوق کی طرف متوجہ کیا اس سے کہیں زیادہ عورتوں کو اپنے فرض کی ادائیگی کی تلقین کی۔وہ خواتین کو صرف گھر کی چہار دیواری میں محصور رکھنا نہیں چاہتے تھے۔بلکہ پردے کے حدود کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرے میں ان کو باوقار مقام دلانا چاہتے تھے اور اس کے لیے لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ازحد ضروری قرار دیا۔وہ 'علم' کو 'عقل کی غذا' قرار دیتے تھے۔اور 'جہل' کی تاریکی کو 'علم' کی روشنی سے دور کرنا چاہتے تھے۔کیونکہ 'علم' سے معلومات میں وسعت پیدا ہوگی اس سے 'عقل' بھی روشن ہوگی اور دماغ کے دریچے بھی وا ہوں گے، پھر حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور دنیا کی بہت سی باتیں اس کی بدولت ان کی سمجھ میں آنے لگیں گی۔اس طرح راشدالخیری نے اپنی فہم وتدبر سے علم کی وہ شمع روشن کی جس سے معاشرے کی تاریکی میں کمی واقع ہوئی اور گھروں میں علم کے چراغ جلنے سے توہمات دور ہوئی، عورتوں میں سلیقہ اور فہم وفراست پیدا ہوئی۔

''وہ 'علم' کو 'عقل کی غذا' قرار دیتے تھے۔ اور 'جہل' کی تاریکی کو 'علم' کی روشنی سے دور کرنا چاہتے تھے۔کیونکہ 'علم' سے معلومات میں وسعت پیدا ہوگی اس سے 'عقل' بھی روشن ہوگی اور دماغ کے دریچے بھی وا ہوں گے، پھر حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور دنیا کی بہت سی باتیں اس کی بدولت ان کی سمجھ میں آنے لگیں گی۔ اس طرح راشدالخیری نے اپنی فہم وتدبر سے علم کی وہ شمع روشن کی جس سے معاشرے کی تاریکی میں کمی واقع ہوئی اور گھروں میں علم کے چراغ جلنے سے توہمات دور ہوئی، عورتوں میں سلیقہ اور فہم وفراست پیدا ہوئی''۔

راشدالخیری چاہتے تھے کہ اسلام نے عورتوں کا جو مرتبہ مقرر کیا ہے وہ انھیں حاصل ہو۔وہ اپنی معاشرت سے 'جوہر قدامت' کو نہ جانے دیں۔دراصل وہ چاہتے تھے کہ ہماری عورتیں مغرب کی خوبیوں سے ضرور

فائدہ اٹھائیں لیکن اپنی انفرادیت اور مشرقیت نہ کھوئیں تاکہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہو جس میں عورت کو باوقار حیثیت حاصل ہو۔ راشدالخیری مشرقی تہذیب کے پرستار تھے۔ انھوں نے جو معیار زندگی ہندوستانی عورت کے لیے تجویز کی ہے وہ خیالی اور ناقابل عمل نہیں بلکہ وہ مغرب کی خوبیوں کے ساتھ اسلامی اور خالص مشرقی معاشرت کو بھی برقرار رکھتی ہے اور اس وقت ہندوستانی قوم مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں اپنی تہذیب وتمدن کو گنوا رہی تھی اور انھیں اس بات کا احساس تھا کہ جدید مغربی تہذیب کا یہ طوفان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس سے لڑکیوں کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مغرب کی کورانہ تقلید سے گھریلو زندگی میں سخت انتشار برپا ہوگا اس لیے وہ بار بار عورتوں کو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مغرب کی خوبیاں لے لو لیکن اپنے جوہر نہ گنواؤ۔ خواتین اسلام کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ:

''مغرب کی کورانہ تقلید مسلمان عورت کو تباہ کردے گی۔ ہندوستانی عورت اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ مشرقی ہے اور مشرقی روایات زندہ رکھ کر ہی ترقی کرسکتی ہے۔''

(عصمت، سالگرہ نمبر 1964)

راشدالخیری کا اصل مقصد اصلاح نسواں، حقوق نسواں اور فرائض نسواں تھا۔ ان کے نزدیک اسلامی نظام زندگی ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہ خواتین میں حقیقی مذہبیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''کوئی شخص مذہب سے الگ ہوکر مشکل سے ترقی کرسکتا ہے اور صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو برے کاموں سے روک سکتا ہے۔ مذہب کی یہ لاپرواہی بڑھتے بڑھتے اس کو (عورتوں کو) اس قابل کردیتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کو ادا کرنے میں غفلت سے کام لیتی ہیں۔ غرض کوئی لڑکی اس وقت تک اپنی زندگی اچھی طرح نہیں گزار سکتی جب تک کہ وہ مذہب کے احکام کی پابند نہ ہو۔''

(علامہ راشدالخیری: زیور اسلام، عصمت بک ڈپو دہلی، طبع اول 1938، ص:63)

اس وقت عورتوں کی تعلیم سے محرومی مردوں کی غفلت اور سماجی رکاوٹوں کے علاوہ خود ان کی تعلیم سے بدظنی ان کی جہالت کی ذمے دار تھی۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ تعلیم کسب معاش کا ایک وسیلہ ہے اور صرف مردوں کے کام آسکتی ہے۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر عورتیں بے راہ روی کی طرف مائل ہوجائیں گی۔ چنانچہ نسیمہ کی ماں اس کے لکھنے پڑھنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہتی ہے:

''لکھنا سکھانے کی تو میری ہرگز صلاح نہیں۔ کون سے دفتر لکھنے ہیں۔ لکھنا آتا ہے تو جس کو جی چاہا لکھ بھیجا۔''

(صبح زندگی، ص:39)

اس قسم کی ناپسندیدہ باتیں شریفوں کی لڑکیاں عام طور سے نچلے طبقے کی عورتوں کی صحبت میں اختیار کرتی تھیں۔ مائیں بے پروائی اور غفلت کے سبب لڑکیوں کو ایسی صحبت سے دور نہیں رکھتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شرفا کی لڑکیاں عام طور سے پست اخلاق اور بری عادتوں کا شکار ہوئیں۔ تعلیم وتربیت کی بیگانگی نے شرفا کی عورتوں کو خانہ داری کے سلیقے سے بھی ناآشنا کردیا۔ اس سلسلے میں ان کی عدم توجہی سے ہر گھر میں جو انتشارات بے ترتیبی نظر آتی تھی اس کا ذکر راشدالخیری نے ''صبح زندگی'' اور ''طوفان حیات'' میں کیا ہے۔

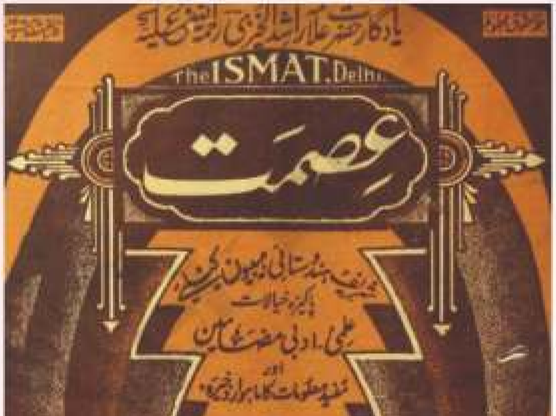

راشدالخیری اپنی قوم میں بیدار مغز بیویاں، اور مائیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق مسلمانوں کی ترقی کا تمام تر انحصار لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر ہے۔ لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ قدامت پرستوں کا فرقہ تعلیم نسواں کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں اس کی وحشت دور کرنے کے خیال سے عورتوں کی تعلیم کا مذہبی جواز بھی پیش کیا ہے۔ ایک جگہ نقل کرتے ہیں:

''ہمارے پیغمبر صاحب نے فرمایا ہے کہ علم ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔ پیغمبر زادیاں اور پیغمبر صاحب کے زمانے کی عورتیں علم کا دریا تھیں۔ یہ تو موٹی سی بات ہے کہ علم آدمی کو آدمی بناتا ہے۔'' (صبح زندگی، ص:60)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر تعلیم کا یہ منشا ہے کہ آدمی مذہب چھوڑ دے تو میں کہتا ہوں تعلیم گناہ، سخت گناہ ہے۔''

(جوہر قدامت، ص:184)

اس وقت جہالت کی سب سے بڑی دین ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ہے جس میں اس عہد کی خواتین عام طور سے اس مرض میں مبتلا تھیں۔ راشد الخیری نے عورتوں کی اس کمزوری پر کڑی تنقید کی ہے جو اس وہم میں گرفتار ہو کر ایسی حرکتوں کی مرتکب ہوتی تھیں جو عقل و شرع دونوں کی رو سے معیوب ہیں۔:

راشد الخیری کے یہاں ایک عورت کی سلیقہ شعاری کا تصور یہ ہے کہ سعادت مند اور امور خانہ داری میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی بیوی ہونے کے لیے اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہونا چاہیے کہ شوہر کو اپنا ہم خیال کرے یا خود اس کی ہم خیال ہو جائے تاکہ کسی طرح خیال کے اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی کامیابی کی پہلی شرط بیوی کے خلوص و ایثار اور خدمت واطاعت کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے اکثر ناولوں میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے ظلم وجبر کے باوجود اس کی اطاعت سے منہ نہیں موڑتیں۔ مثلاً ''جوہر قدامت'' کی ''زاہدہ'' اور ''طوفان حیات'' کی ''ناصرہ'' اس قسم کی بیویوں کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان کے ذریعے راشد الخیری امت مسلمہ کی مثالی بیویوں کو شوہر کی مکمل اطاعت شعاری کا پیغام دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میرا دین، میری دنیا، میری جنت، میری دوزخ، میرا خدا، میرا رسول، میرا عذاب، میرا ثواب جو کچھ ہے اس شخص کے ہاتھ میں اور اس کی صورت کے ساتھ ہے.... میں مسلمان ہوں شوہر کی خدمت میرا فرض اور اس سے میری ہمدردی میری زندگی کا عین مقصد۔ بچے کو روتی ہوں میری مامتا ہے کسی پر احسان نہیں۔ مگر شوہر سے ہمدردی خدا کا حکم اور رسول کا ارشاد ہے۔''

(طوفان حیات، ص:57)

راشد الخیری متوسط طبقے میں پیدا ہوئے۔ اس طبقے کی زندگی اور طرز معاشرت کے ہر پہلو سے انھیں بخوبی واقفیت تھی۔ ان کے ذاتی مشاہدے اور تجربات نے انھیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور کی اصلاحی تحریکات کے باوجود سماج میں عورت کی کوئی وقعت نہیں۔ انھوں نے عورتوں کی پستی، زبوں حالی اور ان کے مسائل کو اپنا دکھ درد سمجھ کر اس کا مداوا کرنے کی سعی کی اور نہ صرف اپنے ناولوں بلکہ تمام ادبی تخلیقات کا موضوع طبقۂ نسواں کی زندگی اور اس کے مسائل کو بنایا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''مرے سامنے صرف مسلمان عورت ہے۔''

(عصمت، سالگرہ نمبر 1964، ص:647)

راشد الخیری نے تلخ حقائق کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا تھا۔ وہ خواتین کی مظلومیت پر دکھی تھے اور سماج میں انھیں ایک باوقار مقام دلانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے مسلم قوم کو نظم وضبط، صبر واستقلال، خودداری، اخوت وہمدردی، علم وآگہی کی تعلیم اور انسانیت کا پیغام دیا۔ اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ مثلاً لڑکیوں کی پیدائش، طلاق، معاشرتی ناہمواریاں، تعصبات، خوشامد وغیرہ۔ ان کے افسانوں کے ان اقتباسات سے ان کے رنگ ومزاج کا اظہار ہوتا ہے:

''میری رائے میں لڑکی کی ولادت ایک ناگہانی مصیبت ہے اور سو جھگڑوں کا جھگڑا صرف عورت ذات۔''

(شرع کا خون، حور اور انسان، ص:32)

عورت جو حیات انسانی کے فروغ کا وسیلہ بھی ہے اور بحیثیت ماں، بیوی، بیٹی اور بہن بھی اس کی پیدائش پر خوشی کے اظہار کے بجائے اس کی ذات کو تمام مصیبتوں کی جڑ کہا جاتا ہے۔ اصلاح رسوم کے نام پر جہیز سے محروم، غلط رواجوں کے نام پر ترکۂ پدری اور وراثت سے بے دخل، سسرال کی سازش کا شکار ہو کر طلاق کی لعنت کو گلے کا طوق بنا کر، فطرت کی ستم ظریفی سے بیوہ ہو کر یہ بے اجرت خدمت کرتی ہے، بے فیض محبت کرتی ہے۔ راشد الخیری نے معاشرے میں پھیلی ہوئی اس طرح کے بے شمار ریاکاریوں کو اپنا مقصد بنایا اور نسوانی زندگی کی معاشی اور معاشرتی فلاح وبہبود کے لیے دردوغم میں ڈوبے ہوئے کئی افسانے اور کہانیاں تخلیق کیں جس کے سبب ان کو 'مصورِ غم' 'محسن نسواں' اور 'عورتوں کے سرسید' کہا جاتا ہے۔ سید احتشام حسین راشد الخیری کے اس اچھوتے انداز بیان اور ادبی خدمات کا اعتراف کچھ اس طرح

کرتے ہیں:

”راشدالخیری نے ڈپٹی نذیر احمد کی بنائی ہوئی راہ کی پیروی کو ہی مطمح نظر مانا اور نسوانی زندگی کی اصلاح کو اپنا مقصود بنا کے بہت سی دردانگیز کہانیاں لکھیں۔ان کے یہاں رنج والم کا اتنا ذکر ہوتا تھا کہ ان کو مصورِ غم کہا جانے لگا تھا۔ان کی نگاہ میں کوئی بھی خاص فلسفیانہ گہرائی نہ تھی، مگر وہ زندگی کے معمولی حادثات کا تذکرہ اس طرح کرتے تھے، جس سے دردمندی کی ایک غیر معمولی فضا تیار ہوجاتی تھی۔ان کی زبان دلی کی خالص پرکیف بول چال کی زبان تھی اور مسلمان متوسط طبقے کے کرب اور گھریلو زندگی کی آمیزش کو بڑی واقفیت کے ساتھ پیش کر کے وہ ایک ہر دل عزیز اہلِ قلم بن گئے۔“

(سید احتشام حسین: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 1983،ص206)

راشدالخیری پندونصائح کے ذریعہ خواتین کواس بات سے باور کرانا چاہتے ہیں کہ مغربی اثر پورے ہندوستانی ماحول کو تیزی سے اپنی گرفت میں لے جارہا ہے اور انسان مذہب سے بے گانہ ہوتا جارہا ہے اور وہ مسلم عورتوں کو مغربی تہذیب سے دور رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ معاشرت کا عمل بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے اور ماں کی گود اس کا گہوارہ بنتی ہے، بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس کے ماں باپ اس کے مذہبی کردار کی صورت گری کرتے ہیں، اس اعتبار سے معاشرے میں مذہب کی سب سے بڑی محافظ ’ماں‘ ہے۔وہی قوم کی معمار ہے، اس لیے عورت کو صحیح مذہبی تعلیم دینا حیاتِ طیبہ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

راشدالخیری کی نظر میں عورت کی عظمت کا راز ’جذبۂ امومت‘ میں ہے۔وہ ایک عورت کی تعلیم کے ذریعے اس جذبہ کو زندہ جاوید دیکھنا چاہتے ہیں۔کیونکہ خاندانوں کی زندگی اسی ’جذبۂ امومت‘ سے وابستہ ہے۔جس قوم کی مائیں ’فرائض امومت‘ ادا کرنے سے کتراتی ہیں اس کا معاشرتی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔اس کا عائلی نظام انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔لہٰذا آپ ایک عورت کے لیے ’زوجیت اور امومت‘ کا ہی فطری اور حقیقی منصب متعین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک تعلیم یافتہ اور دیندار عورت اپنی انھیں دو حیثیتوں یعنی ’بیوی اور ماں‘ بن کر فطرت کے دو عظیم الشان مقاصد تسلسل نسل انسانی اور تشکیل تعمیر و معاشرہ و ملت کی تعمیل و تکمیل کرسکتی ہے۔

راشدالخیری عورت کو ایسی تعلیم دلانا چاہتے ہیں جو انھیں ”اسلامیت“ کا پابند اور فرائض ”زوجیت و امومت“، بحسن وخوبی ادا کرنے کا اہل بنائے۔ان کا اصل مقصد ’اصلاح معاشرہ‘ اور ’اصلاح نسواں‘ تھا اور بچہ کی پرورش، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے شعور کی تشکیل میں ماں کا بہت اہم رول ہوتا ہے،۔جب ہر گھر میں بچوں کی پرورش صحیح ڈھنگ سے ہوگی تو ایک اچھا خاندان بن سکتا ہے اور اسی طرح اچھے گھر اور اچھے خاندانوں سے اچھا معاشرہ وجود میں آئے گا۔کیونکہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ابتدائی زندگی میں تین چیزیں اس کے ساتھ چلتی ہیں، اس کی نشوونما اور تعلیم، اس کی ذہنی، جذباتی، نفسیاتی، معاشرتی، روحانی اور ثقافتی نشوونما بھی ہوتی ہے اور یہ سارے گوشے ایک چھوٹی سی اکائی میں پروان چڑھتے ہیں۔بچے کی تربیت کی ذمہ داریاں باپ سے زیادہ ماں پر عائد ہوتی ہیں۔بچے والدین سے سیکھتے ہیں اور گھریلو ماحول کا اثر لیتے ہیں۔والدین کے طرزِ عمل سے بچے کو اپنی زندگی کا رخ متعین کرنا ہوتا ہے جو کچھ والدین کرتے ہیں اس کا براہِ راست اثر بچے کی عادات، نفسیات اور شخصیت پر پڑتا ہے۔لہٰذا جس طرح والدین بچے کی جسمانی خوراک کا خیال رکھتے ہیں۔اسی طرح روحانی نشوونما کا بھی خیال رکھنا چاہیے، ان کے اندر دین اور شرم وحیا کی قدریں ڈالنی چاہئیں، کیونکہ بعد میں یہ قدریں نکھرتی رہتی ہیں۔والدین کی کاوش سے اچھا معاشرہ اچھی نسل کو پاتا ہے پس بچے ہی معاشرے، امت مسلمہ اور عالم انسانیت کا مستقبل ہوتے ہیں اگر بچے کی صحیح نشوونما نہ ہوئی اور اس کی تربیت کو نظر انداز کیا گیا تو اس کا مطلب ہے کہ اگلی نسل کو تباہ کردیا گیا۔اس لیے راشدالخیری اصلاح معاشرہ کے لیے تعلیم و اصلاح نسواں کو ضروری اور ہر مسلم عورت کو اسلام کی صحیح اسپرٹ سے واقف کرانا اور اس کے بنیادی اصولوں پر عمل کرانا اہم سمجھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس کے بغیر ایک عورت اپنی زندگی میں ترقی نہیں کرسکتی۔

الغرض! راشدالخیری نے خواتین کو پستی سے نکال کر معاشرتی سطح پر ایک بلند مقام عطا کیا۔انھیں مشرقی و مغربی تہذیب و تمدن اور علم و ہنر کی خوبیوں سے آراستہ کرکے ان کے اندر ایک نیا تصورِ حیات، ایک نیا اندازِ نظر اور نئی بصیرت پیدا کی۔لہٰذا انھوں نے عورت کی اصلاح و بہتری کے لیے جتنی خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

□□□

Zaibun Nesa
127-E, Mahanadi Hostel
Jawharlal Nehru University
New Delhi-110067

فرح

اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کے نسوانی کردار

اکیسویں صدی میں اردو کی خواتین ناول نگار میں جدید فکشن کے قلم کار نے معاشرتی زندگی کو مرکز بنا کے روز بروز پیش آنے والے مسائل کا بطور ردِ عمل جائزہ لے کر اس کے منور امکانات پر مباحثے پیش کیے ہیں اور اس حقیقت سے انحراف بھی ناجائز ہے کہ ابتدا بیسویں صدی کے نصف میں ہی کی جا چکی تھی اس عہد سے ہی اردو ناول میں معاشرے کو موضوع بنانے کا آغاز ہو گیا تھا اور ناول نگاروں نے جہاں تک ممکن ہو سکے عصری تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے اکیسویں صدی کے فکشن میں ادب کے قلم کاروں کو لامحدودیت اور لامکانی کی طرف راغب کیا اور ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ عہد حاضر کی تقریباً دو دہائی کے مختصر عرصے میں ہی ناول کی تخلیق اور تنقید میں کئی ثابت گوشے جیسے ایجاز و اختصار، اسلوب الگ الگ کے امکان، شعور کی رو سے کام لیا جانے لگا ہے۔ چند بلند پایہ ناول نگاروں نے پرانے تنقیدی نظام کے بجائے جدید نظام کی طرف بھی متوجہ کیا اور قدیم سماجی خاکے کی شکست و ریخت انجام دی۔ زمانے کی بدعنوانیوں کو خواتین ناول نگار نے خاص طور سے نئے موضوعات میں قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے کئی مسائل و مذمتوں کو ناول کے جامے میں ڈھال کر پیش کیا ہے بے روزگاری کے مسئلے سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور سیاسی معاشرتی اخلاقی انحطاط سے بھی آشکار کیا ہے تہذیب نو، عدم اعتمادی کی طرف بھی مرغوب کیا ہے۔ پامال قدریں، میڈیا کو حکومتی نظام کا چوتھا ستون تسلیم کرنا اور پھر اس کا غیر مناسب استعمال کرنا جیسے مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خواتین ناول نگاروں نے تعصب پرستی اور کچی بستیوں کے معاینہ کی مکمل عکاسی پیش کی ہے۔ انھوں نے غربت مہنگائی کا بھی نقشہ کھینچا ہے نفرت فساد جیسے مسئلے بھی ناولوں میں نظر آتے ہیں۔ خون ریزی ایذا رسائیاں اور اسپتال کی بے غوری کی بھی متاثر کر دینے والی جھلک ناولوں میں موجود ہے۔ مساج سینٹر جیسے مسائل بھی ناول کے ذریعے نمایاں کیے گئے ہیں لیوان ریلیشن شپ، ہوموسیکس جیسے مسلوں کو بھی ناول نگاروں نے اپنے قلم سے گھیرابندی کی ہے۔ نشہ بندی، طلاق یہاں تک کہ حلالہ کے موضوع پر بھی ناولوں میں متاثر کر دینے والی مرقع کشی کی گئی ہے۔

اکیسویں صدی کی اول دہائی میں جن خواتین ناول نگاروں کے ناولوں نے قابل جگہ بنائی وہ درج ذیل ہیں۔ نسرین ؔبخشی کا 2003 میں ''لفٹ'' ناول منظر عام پر آیا۔ 2004 میں ترنم ریاض کے ''مورتی'' اور پھر 2009 میں ''برف آشنا پرندے'' کی اشاعت ہوئی۔ ثروت خان کا 2005 میں ''اندھیرا پگ'' شائع ہوا۔ 2006 میں خالدہ حسین کے ''کاغذی گھاٹ'' کی طباعت ہوئی۔ نسرین ترنم کا 2007 میں ''فصلیں'' اور پھر ''موسم'' چھپا۔ اشرف جہاں کا ''نرملا'' بھی منظر عام پر آیا۔ 2009 میں افسانہ خاتون کا ناول ''دھند میں کوئی روشنی'' شائع ہوا تو وہیں 2009 میں ہی نسرین بانو کے ''ایک اور کوسی کی بھی'' اشاعت ہوئی۔ آشا پربھات کے ناول ''دھند میں اگا پیڑ'' کی بھی طباعت اسی درمیان ہوئی۔ ناصرہ شرما کا 2012 میں ''بہشت زہرا'' شائع ہوا۔ شفیقہ بیگم کا 2014 میں

''خلش'' ناول چھپا۔شائستہ فاخری کے ناول 2013 میں 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' 2014 میں 'صدائے عندلیب' اور پھر ''اداس لمحوں کی خودکلامی'' کی بھی اشاعت ہوئی۔اس کے علاوہ قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' اور نیلوفر کا ''اوٹرم لین'' اور صادقہ نواب سحر کے ناول اہمیت کے حامل ہیں۔

اکیسویں صدی کی نمائندہ خواتین ناول نگاروں میں پروفیسر ساجدہ زیدی صفِ اول تھیں جن کی شخصیت میں جدید ذہن اور روشن خیالی نمایاں تھی۔ان کے ناول ''مٹی کے حرم'' نے 2000 میں شائع ہو کر نئی صدی کا استقبال کیا۔اس ناول کا موضوع تقسیم ہے۔جس میں انھوں نے تکلیف اور احتجاج کو پیش کیا ہے اس کے معاذ وال انہدام اور روایات کے خلاف جنسی تعلقات کو بھی ناول میں پیش کیا ہے۔ویسے تو اردو ادب میں ساجدہ زیدی کا میدان خاص شاعری تھا اور وہ خود شاعرہ تھیں مگر ''مٹی کے حرم'' سے قبل ان کا ایک اور ناول 1992 میں ''موج ہوا پیچاں'' شائع ہو چکا ہے انھوں نے ناول میں بھلے ہی اپنے دل کی آواز کو سنا ہے مگر علامات واستعارات کی پردہ پوشی کر کے قاری تک بھی اپنی بات پہنچائی ہے۔مصنفہ نے ناول میں چند کرداروں جیسے مرزا اکبر علی خاں اور بیگم فاطمہ کے علاوہ شہربانو نواب صاحب اور ماموا یا پروفیسر عباس عابدی رضا، سعیدہ، سیما، فرزانہ ان تمام کرداروں کے ذریعے مصنفہ نے نوابوں کے محلوں میں ہونے والی سازشوں سے پردہ اٹھایا ہے اکیسویں صدی کے ہندوستان پر صارفیت کا بول بالا ہے تمام اشتہارات میں عورت کی موجودگی کامیابی کی سیڑھی تسلیم کی جاتی ہے۔اکیسویں صدی کی مشہور ناول نگار ترنم ریاض نے ازدواجی زندگی کے موضوع پر 2004 میں ناول ''مورتی''، قلم بند کیا جس میں مرکزی کردار محدود جہاں میں قید دکھائی دیتا ہے اور مقصدیت غالب نظر آتی ہے۔جس سے فن کا قتل ہو جاتا ہے یہی سبب ہے کہ اس ناول کو وہ شہرت میسر نہ ہوئی جو ان کے دوسرے ناول 'برف آشنا پرندے' کو حاصل ہوئی یہ ناول 2009 میں منظر عام پر آیا جس میں مصنفہ کی کشمیری مناظر ماحول کلچر اور تاریخ کی سحر بیانی نے اسے قارئین کی توجہ عطا کی۔ناول میں مرکزی کردار کا رتبہ شیبا کو حاصل ہے جو اپنے دائرے سے باہر ہی نہیں نکل سکی۔مصنفہ نے اس ناول کے ذریعے کشمیر کی سماجی اور ثقافتی فضا جاندار طرز پر پیش کر کے تجلی بخشی ہے اور قاری کو باندھے رکھنے میں بھی انھیں کامیابی ملی ہے۔اسی باعث ناول کے content کو اہمیت حاصل ہے جس میں بغیر تقسیم کے ہندوستان و کشمیر کی خوبیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔مصنفہ کا اسلوب ناول اور افسانے دونوں میں ہی جداگانہ ہے جس سے قاری وابستہ ہو جاتا ہے چونکہ ان کی بنیادی حیثیت بطور شاعرہ ہے اسی سبب شاعری کے نقوش ان کے متن میں جا بجا نمایاں ہوتے ہیں۔اس ناول میں مصنفہ نے گہرے تجربے اور مشاہدے سے کشمیر کی پُرکشش زینت بخش فضا و مناظر کی جلوہ گری کر کے یہ احساس دلایا ہے کہ ''برف آشنا پرندے'' کے کردار گفتگو کے طلب گار ہیں۔تو وہیں انھوں نے اپنے مرکزی کردار شیبا کی حد بندی بھی کر دی ہے۔ناول کا پلاٹ آغاز سے انجام تک جذبات نگاری سے معمور ہے۔''برف آشنا پرندے'' بہترین اسلوب ونثر میں تحریر ناول جس میں موضوع کے اعتبار سے بھی جمالیاتی دلکشی اور صوتی آہنگ موجود ہے دراصل یہ کشمیر سے تعلق رکھتی ہیں اور انھوں نے اپنے اس ناول میں کشمیر پر ہی نگاہ مرکوز رکھ کر فنی رکھ رکھاؤ کی خوبیوں کے ساتھ قاری کو قلبی تسکین فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور سیدھے سادھے پلاٹ میں کرداروں کی زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے مجموعی طور پر ناول کے ان تمام اوصاف نے مصنفہ ترنم ریاض سے شاہکار ناول کی توقعات وابستہ کر دی ہیں۔

'جس دن سے' ناول میں معاشرتی اور تہذیبی جھلک بخوبی نمایاں ہوتی ہے جو عہد حاضر کے مادی صارفی تہذیب کی کدورتیں اور کمزوریاں نمایاں کرتا ہے اس میں معاشرے کی عیش پرستی، جنسی نفسیات سے بھی آشکار کیا ہے اور خود غرضی نفس پرستی جیسے مسئلوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔والدین کے الگ ہو جانے پر اطفال کو بہتر تعلیم نہ ملنے کی صورت میں

نفسیات پر جو اثرات ہوتے ہیں اور وہ ان کی حیات کو کس حد تک متاثر کر سکتے ہیں ناول نگار نے ان پیچیدہ مسائل کو توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ والدین کے الگ ہو جانے سے گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے دونوں اطفال کی حیات پر بڑی حد تک تاثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ نکھل تو شادی شدہ زندگی بھی بسر کر لیتا ہے جب کہ جینو کی حیات تو مجرد ذہنی کشمکش اور رنجیدگی سے معمور ہے۔ تعلیم اور پھر ملازمت کے دوران مہک، نیلا امبری، شلپی، سشما، للی جیسی کئی لڑکیوں نے اس کی زندگی میں دستک دی مگر کوئی بھی تعلق شادی تک نہیں پہنچ سکا۔ ناول کے راوی جیتو کی حیات میں خوف و خلا نظر آتا ہے اور کرب و کشمکش بھی دکھائی دیتی ہے۔ جب اس پر اپنی حیات کی تکلیفوں سے رستگاری حاصل کرنے کا خیال غالب ہوتا ہے تو اس دوران وہ ہٹلر کی سیاسی شخصیت میں ایسے کئی اوصاف دیکھتا ہے جس سے انسان کو نئے طرز حیات سے زندگی گزارنے کا حوصلہ فراہم ہوتا ہے اور کچھ کر دکھانے کی توانائی ملتی ہے۔ ہٹلر کے جو وصف اسے اپنی جانب مرغوب کرتے ہیں وہ حقتاً قابل غور تھے لہٰذا جیتو اسے اپنا آئیڈیل مانتا ہے۔

'جس دن سے' ناول میں ممبئی کا مراٹھی خاندان ہے جس میں مصنفہ نے دھن گر یعنی بنجارہ ذات کی گھریلو کہانی کے ذریعہ ان کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی عکاسی کی ہے۔ وہ قصے میں مراٹھی تہذیب کو ارتقاع بخشنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

مادیت پسند فضا میں تحریر کیا گیا ناول 'جس دن سے' جو اپنی کیفیت میں معاشرتی و تہذیبی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مراٹھی گھرانے میں ہونے والے اختلافات سے علیحدگی کے مسائل و مصائب کی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ ماں باپ کی انانیت اور خراب عادات اولاد کے حال سے لے کر مستقبل پر اپنے تاثرات چھوڑتی ہیں جس کی مثال اس ناول میں دیکھی جا سکتی ہے اسی کے ساتھ یہ ناول سیاست اور مے نوشی میں سرشار کردار جینو کے والد کے کردار کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے ڈرامے اور افسانے میں بھی طبع آزمائی کی ہے جب کہ وہ بطور ناول نگار ہی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ان کے ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ہندی، انگریزی، تیلگو وغیرہ دیگر زبانوں میں بھی اس کے تراجم کیے گئے جس میں انھوں نے فلیش بیک تکنیک سے کام لیا ہے اور اسے وطنی صوبائی انعامات سے سرافراز کیا گیا۔ ناقدین نے بھی اس ناول پر دل کھول کر اپنی رائے زنی کی۔ صادقہ نواب سحر کے دوسرے ناول 'جس دن سے' کی اشاعت 2016 میں ہوئی جس میں انھوں نے فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

'کہانی کوئی سناؤ متاشا' میں صادقہ نواب سحر ایک بلند پایہ ہندوی گھرانے کی خاتون کے ظلم وستم استحصال کو روداد کی طرز میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے اسلوب بیان میں معروضیت پسند ادیبانہ طرز نمودار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے کئی افسانوں جیسے پینٹنگ، دیوار گر، منت شریاں والی، بارش سلگتی راکھ، خلش بے نام سی، وغیرہ میں بھی خواتین کے کئی قسم کے الگ الگ مسائل و مصائب کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح ''کہانی کوئی سناؤ متاشا میں'' متاشا جو ایک خاتون ہے اور ناول کا مرکزی کردار ہے اس کے توسط سے ناول نگار خاتون کی حیات کے کرب اور ضبط و ظرف کی عبرت ناک تصویر پیش کرتی ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں ناولوں کے کرداروں کے باب میں صادقہ نواب سحر افتخار امام صدیقی سے انٹرویو میں برمحل اقرار کرتی ہیں:

> ''دونوں ناولوں کے کردار میں نے حقیقی کرداروں سے لیے ہیں۔ متاشا اور جنیش زندہ جاوید کردار ہیں۔ متاشا کے ایک کردار میں کئی متاشاؤں کے کرب کی جھلکیاں ملتی ہیں اور جس دن سے ناول کے جنیش میں اس جیسے بے شمار نوجوان جو ایک طرف کال سینٹر اور دوسری طرف نوکریوں کے استحصال سے نپٹتے ہیں۔ دوسری جانب خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ میں ان کا وجود ٹوٹتا ہے اور بنتا رہتا ہے۔ کچھ ان کرداروں نے متاثر کیا۔ یقین مانیے یہ کردار ہم سب کے آس پاس موجود رہتے ہیں۔''

(معظم علی، اکیسویں صدی میں اردو ناول روایات اور امکانات، ڈائمنڈ پریس، جوہری بازار، جے پور، مارچ 2018، ص 142)

ناول 'جس دن سے' کا مرکزی کردار مادیت پسندی کے ساتھ صارفیت زدہ معاشرہ اور ماحول میں نوجوان طبقے کی سرگرمی سے منزل مقصود کو تلاش کرنے کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس ناول میں فلیش بیک تکنیک کے توسط سے جینو کے اجڑے خاندان کا عکس ابھر کر آتا ہے۔ جس میں آپ بیتی کی ارضیت واقعیت صداقت حقیقی قصے کا شائبہ طاری کرتی ہے۔ عمومی طور پر سب ہی ناولوں کی بنیاد حیات کے حقائق امکانی احوال او رمسائل پر ہی مستحکم ہوتی ہے۔ مگر چند ناولوں کا خاکہ معاشرتی ملکی حقیقی واقعات جیسے تقسیم ملک اور فسادات پر منحصر ہے۔ مصنفہ درج بالا دونوں ناولوں میں مرکزی کرداروں کے جذبات نفسیات، ذہنی اور داخلی مصائب کے حل میں کوشاں نظر آتی ہیں۔

صادقہ نواب سحر کا 2008 میں جاذبیت کشش سے معمور عنوان پر

ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں عورت کے دکھ کو پیش کیا گیا ہے مصنفہ نے اس کے بیان میں غم خواری لانے کی زبردست کوشش کی ہے ظاہری طور پر سادہ دکھائی دینے والی تحریر سے مطالعے کے دوران اسلوب کا نیا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کے ان ہی اوصاف نے ناولوں کو شہرت بخشی ہے۔ معاشرتی مسائل متاشا کے گرد وپیش استحصال نسواں کا خاکہ تیار کردیتے ہیں اور متاشا کی ڈرامائی ہنرمندی عوام کو اس کی جانب راغب کرنے میں معاون ہوجاتی ہے قاری اس بات کا احساس کرتا ہے کہ بدبختی غم اور افسردگی سے متاشا گھری ہوئی ہے اور اس کی حیات بے انصافی اور لگاتار استحصال کا شکار ہے ناول میں تجسس برقرار رہنے کی صفت سے غم اندوہ کے تذکرے بھی تسلی کے اسباب مہیہ کرادیتے ہیں اور دلچسپی قائم رہتی ہے۔ مصنفہ نے مظلوم خاتون متاشا کی دردناک حیات کو پیش کیا ہے انھوں نے اپنے ناولوں میں استحصال نسواں ہجرت، بے بسی، دلی گھٹن پستہ وشکستہ حالی جیسے عورتوں کے مسائل کو content کے طور پر پیش کیا ہے۔

ان کا دوسرا ناول ''جس دن سے'' کا مرکزی کردا جینو ہے انھوں نے اس کے داخلی وخارجی پہلوؤں کی عکاسی پیش کی ہے اور دیگر ضمنی کرداروں میں جینش کے ماں باپ، بڑا بھائی نکھل اور اس کی زوجہ، نانا نانی، اور ماں کو دھوکا دینے والا چودھری، جینو کی حیات میں دستک دینے والی بے شمار مطلب پرست لڑکیاں شلھی مہک نیلا مبری، سشما کے علاوہ جیتو کے رفیق ساحل سائرہ اور ریحان کی زوجہ وغیرہ کرداروں کی حد درجہ گہرائی سے نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔

ناول ''جس دن سے'' میں صادقہ نواب سحر نے جدید معاشرے کو ترجمان بنا کر پیش کیا ہے جس میں قصے کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے یا اکیسویں صدی کی معاشرت، تعلیم وسیاست کی فضا سے وابستہ ہے اور اس کے ساتھ صارفی وتمدنی پہلوؤں سے بھی آشکار کراتا ہے۔ ناول میں ممبئی کے حیات، معمول ومظاہرہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ حکومتی شعبہ جاتی اور نجی محکمات کی خامیوں اور کمیوں کو ناول میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے تعمیری خیالات کو ناول کا جامہ پہنا کر نمایاں کیا ہے، جس سے ان کا ادب اور معاشرے کے لیے فکری میلان بخوبی نمایاں ہوتا ہے یہ فکری میلان اور رویہ ایک ناول نگار کی اہم ضرورت ہے۔

ناول کا فن دوسری ادبی اصناف کے بلمقابل زیادہ ہمہ گیریت اور کینوس میں وسعت کا تقاضہ کرتا ہے۔ بیانیہ کے لحاظ سے دیکھنے پر بھی اس میں بے شمار امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ کامیاب ناول میں واقعات کے سپاٹ بیان سے کنارہ کیا جاتا ہے اور اس کے بیانیہ کا خاکہ لطیف وبلیغ خصوصیات اور معنویت سے معمور دکھائی دیتا ہے جس میں ماضی حال اور مستقبل ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں اس اعتبار سے ناول تاریخ کے ساتھ عصری دستاویزی شکل بھی لیے ہوئے ہے جس میں آئندہ عصر نو کے خوابوں کی تعمیر بھی موجود ہے۔ ناول میں انسانی حیات کی خارجی اور باطنی سطحیں بھی نظر آتی ہیں جو ماضی حال مستقبل تک سے اپنا تعلق مستحکم کرلیتی ہیں اسی سبب اس میں پیش کی گئی حیات اور اس کے مظاہر کسی بھی ایک عہد کے لیے مخصوص طور پر محدود نہیں کیے جاسکتے۔ واقعات کا عصری تناظر ناول کو تاریخیت کے نزدیک لے آتا ہے جس میں زمانے کے اقدار احیات کی وہ ہیئت بھی پوشیدہ ہوتی ہے جو ماورائے عصر کہلاتی ہے۔

ثروت خان کے ''اندھیرا پگ'' 2005 نے بھی تینوں ادوار یعنی ماضی حال مستقبل کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ ناول راجستھان کی معاشرتی تہذیب کا احاطہ کرتا ہے جسے ملک کی تاریخ میں اپنی آب و تاب شجاعت کی بدولت رزمیے کی اہمیت حاصل ہے جب کہ بعض مذموم روایات اور اقدار نے اس کی تاریخ کو لہولہان اور تہذیب کو ایسا مجروح کردیا ہے کہ تمام ترقی کے دعوے ناقص ہی محسوس ہوتے ہیں۔ راجستھان کی اسی تہذیب کا نقشہ 'اندھیرا پگ' میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کو فکری وجمالیاتی تہہ پر بلیغ معنویت سے سنوارنے پر مخصوص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

ناول کے بیانیہ سے اس کی تحریر کا مقصد بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے اس کے پلاٹ کی بنیاد تہذیبی تناظر پر رینگتے دم توڑتے رواج کے ساتھ وراثتوں سے ہم کنار ہوتی سفاک حقائق پر رکھی گئی ہے۔ناول میں راجستھان کے دور افتادہ قصبے دلیش نوک کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں مرکزی کردار روپ کنور ہے رتن سنگھ اور سبھدرا رانی اس کے والدین ہیں، پھوپھی راج کنور دادا بشن سنگھ اور دادی ماتیشوری ہیں۔ان کرداروں کے علاوہ ناول میں وہاں کے سرپنچ ٹھاکر بلدیو سنگھ ہیں۔

قصبے دلیش نوک میں بے علمی جہالت مفلوک الحالی طاری تھی مخصوص طور سے خاتون تعلیم سے محروم تھیں جب کہ ٹھدر پروہتوں کو ورثے میں ملا تا ترک علم اور کریا کرم ضرور ترقی پر تھا۔ان پروہتوں اور سماج نے ہزاروں برس قبل غیر انسانی رسوم اور روایات کی بنیاد رکھی تھی۔ان ہی پروہت خاندان میں پیدا ہوئی روپ کنور جس کے والد رتن سنگھ ہیں اور یہ بشن سنگ کی پوتی جو انتہائی ذکی اور علم کی طلب گار ہے۔شہر میں اس کا بھائی ڈاکٹری پڑھنے گیا ہے روپ کنور بھی علم حاصل کرنے کی شائق ہے۔اس کی پھوپھی راج کنور شہر میں مقیم ہیں ان کا روشن فکر وخیال انھیں بھتیجی کی حسرت برلانے پر آمادہ کرتا ہے مگر قدیمی وراثت میں ملے رسم ورواج ان کی کوششوں کو ناکام کر دیتے ہیں روپ کنور اور پھوپھی راج کنور کی مخالفت کے باوجود آخر کار نوعمری میں ہی روپ کنور کا بیاہ کر دیا جاتا ہے وہ دو ماہ سے پہلے ہی بیوہ بھی ہو جاتی ہے اور بیوگی کے متعلق ظلم وجبر کا تسلسل سسرال میں شروع ہو جاتا ہے۔اس کی ساس کے جملے اس قول کی وضاحت کرتے ہیں:

> ”آتے ہی ڈاکن دو ہی مہینے میں میرے بیٹے کو کھا گئی۔اب
> اور کھانے کو کیا بچا ہے۔ابھا گن سے کہا تھا، ستی ہو جا۔۔نشہ
> کر کے بیٹھ جاتی چتا میں۔۔ پتہ بھی نہیں چلتا۔۔۔ایک ہی
> بار میں پاپ سے چھوٹ جاتی۔۔۔سیدھے سُورگ ملتا۔۔
> نہیں مانی۔۔۔ہٹ دھرمی۔۔۔اب تل تل کر مرتی رہ،
> سارا جیون۔“

(ثروت خان،اندھیرا پگ،اصیلا آفسیٹ پرنٹرس،دہلی 2005،ص 50)

یہاں تک کہ یہ سلسلہ میکے میں آنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ پھوپھی اس کی حالت سے افسردہ ہو کر سب کی مخالفت کر کے روپ کنور کو شہر میں اپنے گھر پر سکونت پذیر کرواتی ہیں اور پوشیدہ طور پر اسے میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیتی ہیں مگر جب روپ کنور کی ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے کی خبر اس کے قصبے دلیش نوک میں آگ کی مانند پھیل جاتی ہے تو سرپنچ بلدیو سنگھ اور پنچ حویلی میں سبھا کا انعقاد کر کے رتن سنگھ کو گاؤں اور معاشرے سے باہر کر دینے کی دھمکی دے کر اس کی بیٹی کو پنچایت میں پیش کرنے کا حکم صادر کرتے ہیں۔معاشرتی دہشت گردی رتن سنگھ کو بیٹی روپ کنور کی تعلیم ترک کرانے پر بے بس کر دیتی ہے اور وہ اسے واپس گاؤں لا کر کوٹھری کی تاریکی میں دھکیل دیتا ہے۔

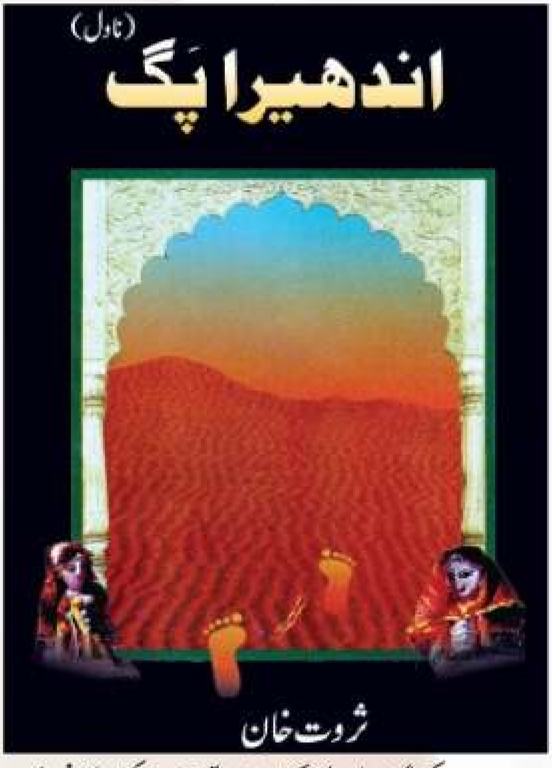

روپ کنور گاؤں لوٹنے کے بعد اپنے آباؤ اجداد کی ان کارفرمائیوں سے واقف ہوتی ہے جس میں انھوں نے قصبے کی مجبور ناتواں خواتین یہاں تک کہ اپنی خادمہ تک کے ساتھ عصمت دری کی اور موت کے گھاٹ اتار کر اپنی حویلی کی پشت تاریک باوڑی میں دفنا دیا اس رازِ مخفی سے آشکار ہونے پر اس میں سماجی روایات سے مخالفت کا جذبہ پنپتا ہے آخر اس کی مزاحمت اسے اور گھر کی خادمہ دھونی کو ظلم وتشدد کے سماجی تعلق سے نجات حاصل کرا دیتی ہے اور ناول خوشی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔'اندھیرا پگ' کے آخری حصے میں ناول نگار ثروت خان نے اس مسئلے کا حل بھلے ہی پیش کر دیا ہو جب کہ ہمارا معاشرہ ان مسائل سے آج بھی دوچار ہے۔موضوع کے لحاظ سے یہ ناول جنسی استحصال اور خصوصی طور پر صدیوں سے بیوہ عورت کے معاشرتی تہذیبی رسوم کی بیڑیوں میں بندھ کر قربان ہو جانے کی عکاسی کرتا ہے جس سے قاری بہت حد تک متاثر ہو کر لرز اٹھتا ہے۔ان ستم پرور رسومات پر کسی قسم کے علم وجدت کی شعاؤں سے بھی ممانعت ممکن

نہیں۔ قانونی کاروائیوں کا بھی ان پر زور و جبر نہیں وہ بھی اس مذمت کے آگے بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ اسے شہری و صنعتی فروغ نے ضرور خارجی تہہ پر تجلی بخشنے میں کچھ حد تک مدد کی ہے جب کہ داخلی طور پر ذہنی رویوں کی تہیں رسومات سے اتنی تاریک ہیں کہ اکیسویں صدی کی تقریباً دو صدی بیتنے کے بعد بھی باطن کو مکمل نور کی شعائیں میسر نہیں۔ عصر حاضر میں بھی دارالسلطنت دہلی سے کچھ دور پر کھاپ پنچایتوں کے توسط سے انسانیت کی پدری بربریت کا شکار ہوتی ہے۔ قانون کے علم بردار کہے جانے والے افراد اور علم و عقل سائنس اور تکنیک کے انعامات یافتہ معزز حضرات بھی تماش بین بنے رہنے پر بے بس ہیں۔ میڈیا کے ذریعہ ان خبروں سے واقف ہوکر چند لمحات اپنا افسوس نمایاں کرتے ہیں اور مباحثوں کے شریک کار بن کر واپس اپنے معمول حیات میں مشغول ہوجاتے ہیں یہ کسی بھی حالات سے متاثر نہیں ہوتے۔

اس عہد میں بیوہ عورت دو راہوں میں کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے سامنے ستی ہونے یا پھر حیات کی تمام پر مسرت آرائش و آسائش سے کنارہ کرکے بے رنگ زندگی بسر کرنے کے راستے ہی موجود ہیں۔ ہمارے یہاں خواتین بیوائیں اس سلوک سے مخصوص معاشرے میں ہی نہیں بلکہ تقریباً ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ مصنفہ خود راجستھان کی نمائندہ ہیں جس کے سبب انھیں وہاں کا گہرا مشاہدہ و تجربہ ہے اور وہ وہاں کی راجپوتانہ آب و تاب سے واقفیت رکھتیں ہیں وہاں کے قلع محل اور حویلیاں بھی اہمیت کی حامل ہیں اس کے علاوہ وہاں کی مذمت میں جنسی تفریق، نابرابری کا سلوک، ستی پرتھا اور بیواؤں کی حیات کو دوزخ کردینے کے سلسلے میں یہ گوشہ قومی سطح پر اس عہد میں بھی امتیازی حیثیت لیے ہوئے ہے، جس کے محلوں بلند تر حویلیوں اور قلعوں کی نمایاں آب و تاب کے پیچھے تاریکی میں دفن تمام ایذا رسائیوں کے سراغ موجود ہیں۔ اس موضوع کو ناول کی شکل میں صفحہ قرطاس پر لانے کے لیے راجستھانی معاشرے سے مناسب کوئی دیگر نظیر نظر نہیں آتی۔ ناول نگار نے اس معاشرے کے تمام تر مخفی راز سے آشکار کرنے میں اپنی لیاقت کا مظاہرہ کیا ہے بیانیہ سے قاری حد درجے متاثر ہوکر بیدار ہوجاتا ہے ناول کا یہی وصف اسے کامیابی عطا کرتا ہے۔ اس کی کرافٹنگ اور تخلیقیت تاثرات کو دوبالا کردیتی ہے۔ ناول نگار نے اپنے واقعات کی کڑیوں کو جس طرز پر وابستہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ راجستھان کے کلچر کو اجاگر کرنے میں مصنفہ کی تانیثی سمجھ اور فکر سے بھی زیبائش میں اضافہ ہوا ہے۔ ناول کے مطالع سے قریب قریب دو صدی پہلے راجستھان کے دیہات میں گزرے اس واقعات کی یاد دہانی ہوتی ہے جس میں روپ کنور نامی خاتون کے ستی ہوجانے کا واقعہ پیش آیا تھا اور اسے دیوی یا ستی ماتا جیسے القابات عطا کیے گئے تھے۔ 'اندھیرا پگ' میں مصنفہ نے ترمیم کی ہے اس میں روپ کنور ریا ستی ہونے سے انحراف کردیتی ہے اور بغاوت کا اظہار کرتی ہے جو ناول نگار کے تانیثی فہم او رفکری رویے کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کی مثال ناول کے آغاز میں فارسی شعر کے طور پر موجود ہے۔

یہ ناول مصنفہ کے تانیثی رویے کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے اور راجستھان کے کلچر کا ترجمان بھی نظر آتا ہے جس سے ناواقف قاری بھی وہاں کی تہذیب سے دوران مطالع باخبر ہوجاتے ہیں۔ راجستھانی زبان کی مٹھاس جابجا مکالموں کی ہیئت میں ظاہر ہوکر معاشرے کے پس منظر سے واقف کراتی ہے یہاں تک کہ قاری کو بھی اس ماحول میں پیوست کرلیتی ہے۔ مکالموں سے ناول میں ماحول سازی اور علاقائیت کا رنگ بھی نمودار ہوتا ہے۔ 'اندھیرا پگ' ناول دستاویزی تصاویر لیے عہد حاضر کی تہذیب کے ان سیاہ مخفی گوشوں کی جانب راغب کرتا ہے جو صدیوں سے رائج ہیں اور ہمارے معاشرے کو بھی تاریک کررہے ہیں۔

اکیسویں صدی میں آشا پربھات کا ناول ''جانے کتنے موڑ'' منظر عام پر آیا اس کی اشاعت 2009 میں ہوئی۔ اس سے قبل 1997

میں کوان کا ایک اور ناول '' دھند میں اگا پیڑ'' شائع ہو چکا تھا۔ صدی کی اوّل دہائی کے خاتمے پر دستک دینے والے ناول '' جانے کتنے موڑ'' میں ایک عورت لتا کی پتا کو پیش کیا گیا ہے۔ رینو بہل کے ناول میں بھی عورت ہی مرکزی رول ادا کرتی ہے۔

شائستہ فاخری کے ناول '' نادیدہ بہاروں کے نشاں'' کی اشاعت 2013 میں ہوئی۔ غالباً اس سے قبل یہ قسط وار آمد رسالے میں شائع ہو چکا تھا۔ اس میں انھوں نے علیزہ کے کردار کو ان خوبیوں سے نوازا تھا کہ وہ زندہ جاوید تسلیم کیا جانے لگا۔ یہ ناول خاتون کے زود وکوب کے مسئلے کو پیش کرتا ہے۔

شائستہ فاخری کا دوسرا ناول 'صدائے عندلیب برشاخِ شب' 2014 میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ناول موضوع اور content دونوں ہی لحاظ سے دلچسپی لیے ہوئے ہے اس کا مرکزی کردار عورت ہے۔ ناول میں عورت کے دو الگ الگ روپ اور برعکس روپ کی عکاسی کی گئی ہے جس سے دولت مندی اور مفلسی کا فاصلہ تو کم نہیں ہوتا مگر جب مصنفہ متضاد کرداروں کو قاری سے روبرو کراتی ہیں تو اس سے ان کی لیاقت ضرور نمایاں ہو جاتی ہے اور آخر قاری ان کا قائل ہو جاتا ہے۔

اگر ہم گزشتہ پچاس برسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ناول نگاری کا خاکہ خاتون کے اردگرد کے مسائل کے ذریعے ہی تشکیل پاتا ہے جو اس بات کی دلیل کامل ہے کہ عورت اگر چاہے تو تمام اصنافِ ادب خاص طور سے فکشن میں کلیدی کردار نبھا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرۃ العین حیدر اس کارنامے کو انجام دے چکی ہیں۔

□□□

Farah
H. No. 98,
Purana M L B College Road
Budhwara, Bhopal-462001 (M.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

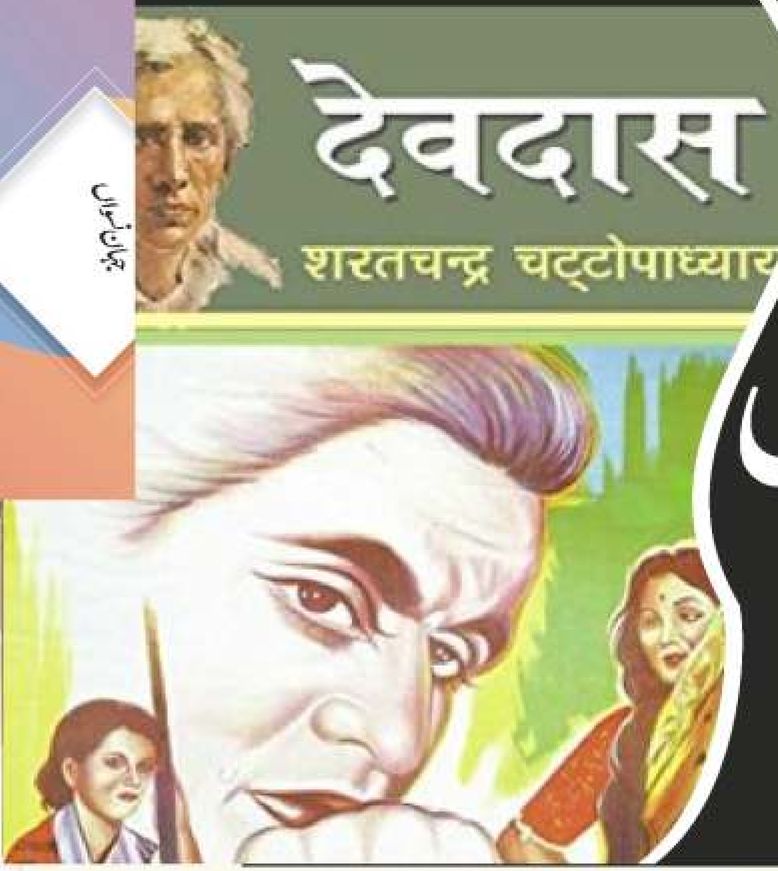

دیوداس
ایک مطالعہ

رائحہ انصار

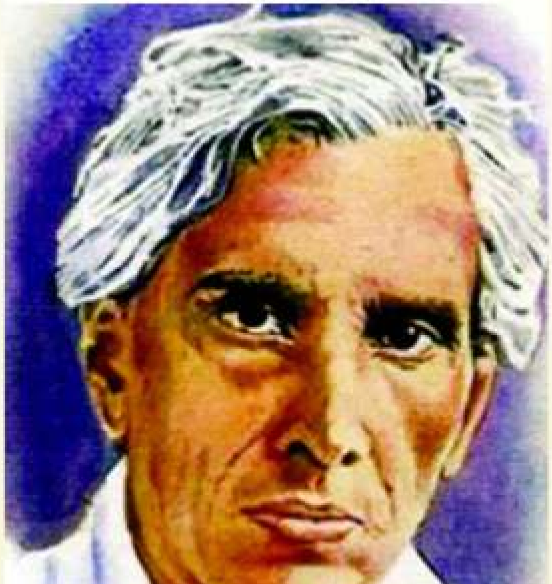

شرت چندر کا شمار بنگالی ہی نہیں ہندوستانی ادبیات کے چند منتخب روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش ستمبر 1876 کو ضلع ہگلی بنگال میں ہوئی۔انھوں نے ادبی ذوق وراثت میں پایا۔طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ان کے شاہکار ناولوں میں 'دیوداس'، 'پرینیتا'، 'پنڈت جی'، 'دیہاتی سماج'، 'شری کانت'، 'آوارہ'، 'برہمن کی بیٹی'، 'راستے کی پکار' اور 'آخری سوال' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ان کے ناولوں میں بیسویں صدی کے بنگالی معاشرے کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں سماجی، سیاسی، معاشی، اور معاشرتی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔موضوع گفتگو ناول ''دیوداس'' میں بھی ان مسائل کو مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

'دیوداس' شرت چندر کا شاہکار ناول ہے۔یہ ناول 1917 میں منظر عام پر آیا۔اس کا ترجمہ نہ صرف ہندوستانی زبانوں بلکہ غیر ہندوستانی زبانوں میں بھی ہوا۔16 ابواب پر مشتمل یہ ناول ایک عشق کی داستان ہے جس کا اختتام المناک ہے۔اس ناول میں تین بنیادی کردار ہیں۔ دیوداس، پاروتی (پارو) اور چندر مکھی۔دیوداس اس کا مرکزی کردار ہے۔جس کے حرکات وسکنات آخرالذکر دونوں کرداروں کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔

اس ناول میں بنیادی طور پر شرت چندر نے جاگیردارانہ نظام، ذات پات، بے میل شادی اور طوائف کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ دیوداس کا تعلق ایک جاگیردار خاندان سے ہے۔اس کا خاندانی رتبہ ہی اس کی محبت کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے۔ناول کا قصہ کچھ یوں ہے کہ دیوداس

اور پارو بچپن سے ساتھ رہتے ہیں اور پارو دیوداس سے اس وقت سے محبت کرتی ہے جب وہ محبت کے معنی سے بھی آشنا نہیں ہوتی۔ دیوداس اس کی کل کائنات ہے۔ وہ اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن طبقاتی سماج عاشق و معشوق کی جدائی کا سبب بنتا ہے۔ پارو کی دادی جب دیوداس کی ماں سے ان دونوں کے رشتہ کی بات کرتی ہے تو وہ کہتی ہے:

"دونوں میں بہت پیار ہے، لیکن اس پیار کے لیے کیا میں لڑکی بیچنے والے خاندان سے لڑکی لا سکتی ہوں؟ اور گھر کے پڑوس میں رشتہ داری چھی چھی۔"

("دیوداس" شرت چندر، مترجم نریندر ناتھ سوز، حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ستمبر 2003، ص36)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج میں محبت کی کیا اہمیت ہے؟ عام طور پر سماج میں محبت پر خاندانی وقار اور عظمت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ طبقاتی فرق ہی پارو اور دیوداس کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ شرت چندر نے ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سماجی رسم و رواج کس طرح انسان کو متاثر کرتے ہیں اور اسے اس حد تک کمزور و مضمحل کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے فہم و فراست کو استعمال کرنے کے بجائے فرسودہ روایت کی پیروی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پارو کی شادی ایک عمر رسیدہ زمیندار بھون موہن سے کر دی جاتی ہے۔ اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے بچوں کی عمر بھی پارو سے زیادہ ہے۔ اس طرح شرت چندر بے میل شادی کے مسئلہ کو اجاگر کرتے ہیں۔ غریبی کی وجہ سے 13 سالہ معصوم پارو کو 40 سالہ زمیندار کے ہاتھوں سونپ دیا جاتا ہے جو اپنے دل میں دیوداس کی پرستش کر رہی ہوتی ہے۔ شادی سے قبل جب اس کی دوست منورما اس کے ہونے والے شوہر کا نام پوچھتی ہے تو پارو کہتی ہے:

"۔۔۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ میرے مالک کا نام دیوداس ہے اور عمر انیس سال ہے۔" (ایضاً، ص42)

پارو کے مذکورہ الفاظ سے اس کے جذبات عیاں ہو جاتے ہیں کہ وہ کس حد تک دیوداس سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ شادی طے ہو جانے کے بعد بھی وہ اسے اپنا سوامی مانتی ہے۔ پریم چند نے بھی اپنے ناولوں میں بے میل شادی کے مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا ناول "نرملا" مکمل طور پر اس مسئلہ کو پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں بھی کم عمر نرملا کی شادی چالیس سال سے زائد عمر کے وکیل طوطا رام سے کر دی جاتی ہے۔ سسرال پہنچ کر ایک مدت تک اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے کیوں کہ اب تک اسی عمر اور اسی قسم کا ایک شخص اس کا باپ تھا۔ اس ناول کا اختتام نرملا کی المناک موت پر ہوتا ہے۔ مرنے سے پہلے وہ اپنی بچی کو اپنی نند کے حوالے کرتے ہوئے وصیت کرتی ہے کہ:

"چاہے کنواری رکھیے گا چاہے زہر دے کر مار ڈالیے گا مگر نا اہل کے گلے نہ باندھیے گا۔ اتنی ہی آپ سے میری بنتی ہے۔"

("نرملا" پریم چند، کلیات پریم چند 6، مرتبہ مدن گوپال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ستمبر 2001، ص171)

نرملا کے ان الفاظ کے ذریعے بے میل شادی کے المناک انجام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نرملا کے مطابق بے جوڑ شادی سے بہتر یہ ہے کہ لڑکیوں کو زہر دے کر مار دیا جائے۔ شرت چندر اور پریم چند نے بے میل شادی کے جو مسائل پیش کیے ہیں وہ دورِ حاضر کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ آج بھی ہم اپنے ارد گرد کتنی ہی پارو اور نرملا کو دیکھتے ہیں جو اپنی خواہشات کو اپنے دل میں دفن کر کے بظاہر خوشحال زندگی گزار رہی ہیں اور ان کی آہیں ان کی خواہشات کے ساتھ ہی ان کے سینوں میں دفن ہو چکی ہیں۔

ناول 'دیوداس' میں شرت چندر نے طوائف کے مسئلہ کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طوائفیں سماج کی ہی پیداوار ہوتی ہیں کیوں کہ ان کا پیشہ ان شریف اور خاندانی مردوں کی وجہ سے چلتا ہے جو اپنی تمام خطاؤں کے باوجود خود کو پاک باز سمجھتے ہیں لیکن ان عورتوں کو انسان کا بھی درجہ نہیں دینا چاہتے۔ ناول کا مرکزی کردار دیوداس چندر مکھی طوائف کے کوٹھے پر بار بار جاتا ہے مگر اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھتا ہے اور اس سے کہتا ہے:

"۔۔۔ تم نہیں جانتی چندر مکھی میں تم لوگوں سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ نفرت کرتا رہونگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں یہاں آؤں گا۔۔۔"

("دیوداس" شرت چندر، مترجم نریندر ناتھ سوز، حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ستمبر 2003، ص87)

مندرجہ بالا اقتباس سے ان مردوں کی متضاد ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ایک طرف تو طوائفوں کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ان کوٹھوں کی رنگا رنگی کا سبب ان کی ہی آمد و رفت ہے۔ چندر مکھی کے پیشہ ترک کرنے کے بعد بھی اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ چندر مکھی کا کردار ہمیں رسوا کے کردار 'امراؤ جان' اور پریم چند کے کردار 'سمن' کی یاد دلاتا ہے کیوں کہ پیشہ ترک کر دینے کے باوجود سماج انھیں بھی

قبول نہیں کرتا ہے۔ دراصل شرت چندر، رسوا اور پریم چند تینوں ہی اس نکتہ کو پیش کرتے ہیں کہ ایسی عورتیں جب ایک بار سماجی اصولوں سے بغاوت کر کے اس دائرے سے نکل جاتی ہیں تو پھر سماج دوبارہ انھیں قبول نہیں کرتا۔ یہ روسیاہی ہمیشہ کے لیے ان کا مقدر بن جاتی ہے اور معاشرے میں انھیں کبھی باعزت فرد کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس ناول میں شرت چندر نے Pre marital relationship اور Extra marital relationship کو بھی موضوع بنایا ہے۔ دیوداس اور پاروتی کی بچپن کی محبت Pre marital relationship ہے اور اس تعلق کی وجہ سے دیوداس اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے مگر طبقاتی سماج کی پابندیوں کی وجہ سے پارو سے اس کی شادی نہیں ہو پاتی۔ پاروتی شادی کے بعد قانونی رشتہ Marital relationship اور غیر قانونی رشتہ Extra marital relationship کے بیچ ڈولتی رہتی ہے۔ لیکن یہی طبقاتی سماج دیوداس کو شراب و شباب اور چندر مکھی طوائف جو Extra marital relationship کو ظاہر کرتی ہے کی آغوش میں پناہ لینے سے نہیں روکتا اور سماجی تضاد کی انتہا یہ ہے کہ اسے سہارا دینے والی چندر مکھی کو بھی گھٹیا نظریوں سے دیکھا جاتا ہے۔

ناول 'دیوداس' کا اصل حسن کردار نگاری میں ہے۔ ناول میں مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ثانوی کردار بھی کافی متحرک ہے۔ یہ کردار قاری کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں کہ ان کا نقش دیر تک ان کے ذہن پر قائم رہتا ہے۔ وشنو پربھاکر شرت چندر کے کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ آدمی کو دیوتا کی طرح نہیں بلکہ ایک انسان کے طور پر پیار کرتے ہیں۔۔۔ان کے کردار خصوصیت رکھتے ہوئے بھی اس دھرتی کی مٹی سے بنے گوشت پوشت کے پتلے ہیں۔''

(''آوارہ مسیحا'' وشنو پربھاکر، مترجم راشد سہوانی نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، 2008ء، ص19)

ناول 'دیوداس' کے کردار کا تعلق بھی عام زندگی سے ہے۔ وہ کوئی دیوتا نہیں ہے بلکہ عام انسان ہے جس کے اندر خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی ہیں۔ دیوداس ناول کا ایک دلچسپ کردار ہے۔ وہ متعلقہ عہد کے اعلیٰ طبقے کے نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ دیوداس بچپن سے ہی مغرور اور خود سر ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس میں نہ تو فیصلہ لینے کی قوت ہے اور نہ ہی اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی صلاحیت۔ وہ کسی کام کو کرنے سے پہلے اس پر غور و فکر نہیں کرتا ہے۔ جب اس کے والدین پارو سے اس کی شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور پارو کو لکھتا ہے کہ:

> ''۔۔۔ماتا جی اور پتا جی دونوں میں کوئی بھی ہماری شادی پر رضا مند نہیں۔ تمھارے سکھ کی خاطر انھیں دکھ دوں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ پھر ان کی مرضی کے خلاف میں کوئی بھی کام کیسے کر سکتا ہوں۔۔۔کوشش کرو کہ مجھے بالکل بھول جاؤ اور بھلا دو۔ میں سچے دل سے دعا کرتا ہوں کہ پارو تم ہمیشہ سکھی رہو۔ بس سکھی رہو۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔''

(''دیوداس'' شرت چندر، مترجم زندر ناتھ سوز، حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ستمبر2003ء، ص57)

مذکورہ اقتباس کے آخری جملہ 'اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں' سے قاری کو دیوداس کے Surrendering attitude کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں اس کا کردار ہملیٹ (Hamlet) کے کردار کے مشابہ نظر آتا ہے جو کہ to be اور not to be یعنی کروں یا نہ کروں کی کشمکش میں رہتا ہے۔ لیکن دیوداس کو جب محبت کا احساس ہوتا ہے تو وہ پارو سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن پارو انکار کر دیتی ہے۔ لہٰذا وہ شراب اور طوائف کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔

دیوداس دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہے۔ وہ پارو سے عشق کرتا ہے اور یہ ہی اس کی کل کائنات ہے۔ اس کے دل میں وصال کی خواہش ہے اور محبت کے لیے خود کو فنا کرنے کا جذبہ بھی۔ بالآخر وہ اپنے معشوق سے وصال کی خواہش دل میں لیے ہوئے اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ اس طرح وہ محبت میں ناکام عاشق کی علامت بن جاتا ہے جو مجنوں، فرہاد، رانجھا اور مہیوال کی طرح ہی ایک مثالی کردار ہے۔

ناول کا دوسرا اہم کردار پاروتی ہے۔ وہ دیوداس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جب اس کی شادی بھون چودھری سے ہو جاتی تو وہ اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتی ہے اور اپنی خواہشات کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ دیوداس کے مقابلے میں وہ کافی بہادر ہے لیکن سماجی اصول و روایت اسے کمزور کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف اپنے سسرال کے خاندانی رشتوں کو نبھانے کے لیے مجبور ہے اور دوسری طرف دل میں دیوداس کی پوجا کرتی ہے۔ غالب کے الفاظ میں 'کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے' کی کشمکش سے دوچار ہے۔

پاروتی کے علاوہ چندر مکھی کا کرار بھی قابل ذکر ہے۔ چندر مکھی ایک طوائف ہے۔ وہ دیوداس سے متاثر ہو کر اس سے محبت کرنے لگتی

ہے۔وہ دیوداس کے لیے اپنا پیشہ ترک کر دیتی ہے لیکن اسے دیوداس کی محبت حاصل نہیں ہوتی ہے۔شرت چندر نے اس کے ذریعہ طوائف طبقے کی تصویر کشی کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔وہ اپنے اندر ایثار کا جذبہ لیے ہوئے ہوتی ہے چاہے اس کا تعلق کوٹھے سے ہی کیوں نہ ہو۔ایک چھوٹا سا واقعہ چندر مکھی کی زندگی کو تبدیل کر دیتا ہے اور وہ عیش وعشرت کو ترک کر کے ایک گاؤں میں زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔

"ناول "دیوداس" حقیقت نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے .اس ناول میں شرت چندر سماج کے فرسودہ روایات پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں کہ ذات پات کی پابندیوں کی اصل حقیقت کیاہے ؟کیا ایسی پابندیاں جن میں انسان کی خوشیوں اور غموں کا خیال نہیں رکھا گیا ہو اس قابل ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے ؟یہ سماجی قاعدے قانون ہی دیوداس اور پارو کے المیہ کا سبب بنتے ہیں.ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد آج بھی فرسودہ رسم و رواج کا شکار ہیں."

ناول "دیوداس" حقیقت نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔اس ناول میں شرت چندر سماج کے فرسودہ روایات پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں کہ ذات پات کی پابندیوں کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا ایسی پابندیاں جن میں انسان کی خوشیوں اور غموں کا خیال نہیں رکھا گیا ہو اس قابل ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے؟ یہ سماجی قاعدے قانون ہی دیوداس اور پارو کے المیہ کا سبب بنتے ہیں۔ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد آج بھی فرسودہ رسم و رواج کا شکار ہیں۔منمتھ ناتھ گپت ناول "دیوداس" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "دیوداس اور پاروتی شرت بابو کے دماغ کی اپج نہیں ہیں بلکہ وہ ہندوستان کے گھر گھر میں موجود ہیں۔اس طرح وہ ہندوستانی شادی کے ڈھول کے اندر کی پول کو اس خوبصورتی کے ساتھ کھول دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

بقول نریندر ناتھ سوز:

("شرت چندر ویکتی اور ساہتیہ کار" منمتھ ناتھ گپت، نیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 1963، ص157)

"دیوداس" بھی شرت بابو کا ایک شاہکار ناول ہے۔جس کو پڑھنے کے بعد انسان رو اٹھتا ہے۔اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارے سماج میں کس قدر کمزوری پائی جاتی ہے۔ناول میں دیوداس جیسے ٹھوس کردار بھی موجود ہیں اور پاروتی جیسی عورت بھی۔اس کے علاوہ پاروتی جیسے کردار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صدیوں سے عورت سنگ دل مرد کے ذرے ذرے کو اپنی آنکھوں کے آنسوؤں سے سینچ رہی ہے۔کاش کبھی تو اس پتھر میں زندگی کے آثار پیدا ہوں۔کبھی تو اس میں جان آجائے۔ناول میں عورت کے دل کے پیار، درد، کسک، ممتا اور ایثار کا غلبہ ہے۔اتنا درد اور اتنی کسک ہے کہ دل دہل اٹھتا ہے۔روح چیخ اٹھتی ہے اور آنکھیں رو اٹھتی ہیں۔

("دیوداس" شرت چندر، مترجم نریندر ناتھ سوز، حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ستمبر 2003، ص9)

"دیوداس" ایک ایسا ناول ہے جس میں شرت چندر نے سماجی، طبقاتی اور عوامی کشمکش کو پیش کیا ہے۔یہ ناول بیک وقت جاگیردارانہ نظام، ذات پات، بے میل شادی اور طوائفوں کے مسائل کا ترجمان ہے۔شرت چندر نے اس ناول میں کرداروں کی ظاہری وباطنی کشمکش کو فطری انداز میں پیش کیا ہے۔دیوداس، پاروتی اور چندر مکھی تینوں ہی فرض اور محبت کے درمیان ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔یہ ناول رومانی ہونے کے ساتھ المیہ بھی ہے جہاں کبھی جذباتیت کا اظہار ہوتا ہے تو کبھی شدت پسندی کا۔یہ ایک شاہکار ناول ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی بار 1935 میں بنگالی اور اس کے بعد مختلف ہندوستانی زبانوں میں پیش کیا گیا۔

❑❑❑

Raiha Ansar
Research Scholar
Department Of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (UP)

انصاری شاہین عبدالحکیم

قیدی کا کمبل اور احمد فراز

''قیدی کا کمبل'' اس عنوان سے ذہن کے کسی گوشے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی افسانہ ہوسکتا ہے یا کوئی کہانی ہوسکتی ہے، گوکہ یہ عنوان ایک شعر سے ماخوذ ہے جو اردو ادب کے ایک اہم اور معروف شاعر احمد فراز کا پہلا شعر ہے:

سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

اس شعر میں ایک بچے کی اپنے والدین سے شکایت ہے، وہ بچہ کہتا ہے کہ ''آپ سب کے لیے عمدہ دُکان سے کپڑے لائے ہیں اور میرے لیے ایسے کپڑے لائے ہیں جیسے یہ کسی قیدی کا کمبل ہے جو اسے اوڑھنے کے لیے جیلر دیتا ہے۔'' اکثر بچے ایسی شکایتیں اپنے والدین سے کرتے ہی ہیں۔ مگر کچھ خاص اپنی شکایت اشعار میں ڈھال کر کرتے ہیں تو یہی بچے مستقبل میں کسی اعلیٰ مقام پر پہنچنے والے ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر احمد فراز نے اپنی کم عمری میں کہا تھا، اور یہی شعر ان کی زندگی کا پہلا شعر قرار پایا ہے۔

احمد فراز 12 رجنوری 1931 میں کوہاٹ، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام سید احمد شاہ تھا، فراز ان کا تخلص ہے۔ انھوں نے ایڈورڈز کالج (پاکستان) سے تعلیم حاصل کی، اردو اور فارسی میں ایم۔اے۔کیا۔ دورانِ تعلیم انھوں نے پاکستان ریڈیو کے لیے فیچرز لکھے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''تنہا تنہا'' اُس وقت شائع ہوا جب وہ بی۔اے۔ میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس کم عمری میں پہلا مجموعۂ کلام شائع ہونا اپنے آپ میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی انھیں یونیورسٹی میں لیکچرر کی ملازمت کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ دورانِ ملازمت ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''دردِ آشوب'' شائع ہوا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد ''پاکستان نیشنل سینٹر'' پشاور، کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ 1976 میں ''اکادمی ادبیاتِ پاکستان'' وجود میں آئی تھی، اس اکادمی میں انھیں پہلا منتظمِ اعلان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ 1989 میں ''پاکستان اکادمی'' کے چیرمین مقرر ہوئے۔ 1991 میں ''لوک ورثہ'' اور 2006 میں ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کے سربراہ کے بطور اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

احمد فراز کو پہلا ایوارڈ 1966 میں پاکستان رائٹرز گلڈز کی جانب سے ملا۔ ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''دردِ آشوب'' کے لیے دیا گیا۔ بعدازاں انھیں 1988 میں ''فراق گورکھپوری ایوارڈ'' سے بھارت نے نوازا۔ 1990 میں ''اباسین ایوارڈ''، 1991 میں اکیڈمی آف اردو لٹریچر (کینیڈا) کی جانب سے ملا۔ 1992 میں ''ٹاٹا ایوارڈ'' (بھارت) سے سرفراز کیا گیا۔

احمد فراز کی تخلیقات کو پیشاور یونی ورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (بھارت) نے اپنے نصابِ تعلیم میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے فن اور ان کی شخصیت پر Ph.D کے مقالے بھی لکھے گئے۔ جامعہ ملیہ یونیورسٹی میں ''احمد فراز کی غزل'' اور بہاولپور میں ''احمد فراز: فن اور

شخصیت'' کے عنوان سے مقالے تحریر کیے گئے ہیں۔ انھیں ''ہلالِ امتیاز، ستارۂ امتیاز، نگار ایوارڈز'' سے بھی سرفراز کیا گیا۔ احمد فراز وہ خوش بخت شاعر ہیں جن کی بیش تر شاعری کا ترجمہ انگریزی، ہندی، پنجابی، فرانسیسی، روسی، جرمنی اور یوگوسلاوی زبانوں میں کیا گیا۔

احمد فراز نے فوج میں بھی ملازمت کی تھی، جس دوران ان کی شاعری عروج پر تھی۔ فوج میں رہتے ہوئے انھوں نے سیاست بازی اور آمرانہ رویوں کے خلاف شعر کہے تھے جس کی پاداش میں احمد فراز کو جلاوطنی کے کرب سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ انھوں نے ضیاالحق کے مارشل لا کے خلاف بھی نظمیں لکھیں جو کافی حد تک ان کی مقبولیت کا سبب بنیں۔

احمد فراز نے صنفِ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات روایتی اور جدید رہے ہیں۔ ان کے 14 مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ''تنہا تنہا، دردِ آشوب، شب خون، نایافت، میرے خواب ریزہ ریزہ، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، پسِ انداز موسم، سب آوازیں میری ہیں، خوابِ گُل پریشاں ہے، بودلک، غزل بہانہ کروں، جاناں جاناں اور اے عشق جنوں پیشہ'' وغیرہ۔

احمد فراز کا بہت مشہور شعر ہے جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تغزل کا شعر ہے لیکن اس شعر کی گہرائی میں مجھے یہ تجربہ اور مشاہدہ نظر آتا ہے کہ انسان فرصت کے اوقات میں کتابوں کے مطالعے کے بعد ایک کھلا ہوا پھول جو بُھتے (Book Mark) کے طور پر استعمال ہوا ہو اور پھر اپنی مصروفیات کے سبب اُس کتاب کو کہیں رکھ کر بھول جائے اور وہ کتاب جب دوبارہ کھلے گی تو یقیناً وہ پھول مُرجھایا ہوا ملے گا، اسی طرح کسی شخص کے ساتھ ایک طویل وقت گزارنے کے بعد جب وہ بچھڑ جاتا ہے تو وہ شخص بھی اُسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح خوابوں میں یاد آجاتا ہے، دراصل اس شعر میں یہی ملاقات کا تصور نظر آتا ہے۔ آپ بھی غور فرمائیں:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

انسانی زندگی میں خوشی اور غم کے لمحات موسموں کی طرح آتے جاتے ہیں، انھیں لمحات کی وجہ سے اُس کے حوصلے بلند بھی ہوتے ہیں اور پست بھی۔ یہ لمحات انسان کو حساس بنا دیتے ہیں۔ جب کبھی وہ تنہا ہوتا ہے تو ان لمحات کو یاد کرکے کبھی مسکراتا ہے، کبھی خود ہی ان یادوں کو مثالوں کی طرح سُناتا ہے اور کبھی خود ہی شکایتوں کا انبار لگا دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود اپنی ہی ذات میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ کچھ لوگ دوسروں سے اپنی خوشیوں کا، اپنے کرب کا اظہار لفظوں میں یا اشاروں میں بیان کرتے ہیں کچھ بدنصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اظہار نہیں کر پاتے یا انھیں موقع فراہم نہیں ہوتا، مگر احمد فراز اُن خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی زندگی کی فرحتیں، حکایتیں، شکایتیں اور ساعتیں سبھی کو بیان کرتے ہوئے اپنی نظمیں اور غزلیں کسی کے نام کردی ہیں۔ یہ بات اُن کی نظم ''یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں'' سے واضح ہوتی ہے:

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں، تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں، یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تیری نذر کر رہا ہوں، یہ اُن زمانوں کی ساعتیں ہیں

احمد فراز کی نظم ''خواب مرتے نہیں'' ایک ایسی نظم ہے جو نوجوانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ خواب ہم دیکھتے تو ہیں مگر اُن خوابوں کی تکمیل کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اُسے اکثر و بیشتر مختلف مسائل و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مصائب پُل صراط کی مانند ہوتے ہیں جنھیں پار کر کے خوابوں کی تکمیل ممکن ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اِن مصائب کا سامنا کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر حالات انھیں اِن خوابوں کو ترک کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، نیز یہ خواب اِنسان کے ذہن و دل میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میرے خواب میری ذات سے اور میرے لیے مکمل نہیں ہوئے تو کیا ہوا، میرے خوابوں کو میرے ہم عصر یا میری نسلیں پورا کریں گی۔ خواب

ایک ایسا عمل ہے جس کو پورا کرنے کی جستجو میں انسان ہر وقت لگا رہتا ہے، موت اگر اس کے قریب بھی آجائے تب بھی وہ خواب دیکھنا نہیں چھوڑتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خوابوں کے ذریعے ہی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام نے کہا تھا:

''خواب وہ نہیں کے جو تم سوتے وقت دیکھتے ہو، خواب تو وہ ہیں جو تمھیں سونے نہیں دیتے۔''

''خواب مرتے نہیں'' اس نظم میں احمد فراز کہتے ہیں کہ خواب جسم کا کوئی حصہ نہیں ہیں جو ریزہ ریزہ ہوجائیں، موت، جسم کو آتی ہے، خوابوں کو موت نہیں آتی، خواب کسی آندھی، طوفان، ظلم، آفت سے نہیں رکتے۔ خوابوں کو نور کے مانند قرار دیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے ایک قطعہ یہاں یاد آرہا ہے:

ہر گھڑی ٹوٹنا ہے، بکھرنا ہے
کام مشکل ہے مگر کرنا ہے
راستے میں ہے کانچ کی دیوار
نور بن کر مگر گزرنا ہے

احمد فراز کہتے ہیں کہ خواب حرف، نور، سقراط اور منصور سبھی کچھ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواب کبھی مرتے نہیں۔ اسی بات کے پیش نظر نظم کے کچھ مصرعے ملاحظہ فرمائیے:

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مرجائیں گے
خواب مرتے نہیں — خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہے — خواب سقراط ہے
خواب منصور ہے

احمد فراز کی شاعری میں رومانیت، انقلابیت، جمالیت اور اشتراکیت وغیرہ جابجا جا ملتے ہیں۔ اُن کے اشعار کے ذریعے روح مضطرب ہوجاتی ہے، دل تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے اور دماغ منتشر الخیال رہتا ہے۔ ان کے اشعار معاشرے کی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور جھوٹ خود بخود عیاں ہوجاتا ہے۔ دل و دماغ ایک دوسرے سے مخاطب ہوکر کہنے لگتے ہیں کہ:

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو الٹتا کون گوہر دیکھتا

جب بھی دل کھول کے روتے ہوں گے
لوگ آرام سے سوتے ہوں گے
زندگی سے یہی گلا ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

انھیں اشعار کے مدنظر ''پروفیسر لطف الرحمٰن'' لکھتے ہیں کہ:

''بیدل اور اقبال کے بعد فراز کی شعریات کی تشکیل و ارتقا میں فیض کی رومانی انقلابیت نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ فیض کی اشتراکی و رومانی روایات کے تخلیقی شعور نے فراز کو داخلی واردات کی جمالیاتی مصوری اور عصری حیات کی تخیلی پیکر تراشی میں رنگ و نور اور نکہت و نغمگی کے امتزاجی قرینوں کی آگہی بخشی ہے۔ جس نے اس کی شاعری کو زندہ دھڑکتا ہوا، حساس تجربہ بنادیا ہے۔''

احمد فراز نہ صرف ہندو پاک میں مقبول ہوئے ہیں بلکہ پوری دنیا میں ان کی مقبولیت کا شہرہ ہوا۔ 2008 وہ سال ہے جس نے فراز کی سانسوں پر قدغن لگادیا، ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ایک بڑا فن کار اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

میرا قلم تو امانت مرے لہو کی ہے
میرا قلم تو امانت مرے ضمیر کی ہے

□□□

Ansari Shahin Abdul Hakim
Assistant Teacher
Al-Ittehad Junior College Of Arts Science
And Commerce For Girls
Gulshan Nagar, R.M Road
Jogeshwari West
Mumbai - 400 102 (M.S)

شاہدہ شاہین

ریچھ

میرے پاپا محکمہ جنگلات میں آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ جنگل کے قرب وجوار میں رہائش کے لیے ان کو ایک بنگلہ الاٹ کیا گیا تھا جو گاؤں سے پرے ایک پتلی سی ندی کنارے واقع تھا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تینوں اطراف گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ گاؤں کے جنوبی سمت میں ایک بہت اونچی خودرو جھاڑیوں سے پُر خطرناک پہاڑی ایستادہ تھی۔ دور دراز مقام پر واقع ہونے کے باوجود اس علاقے میں اسپتال، اسکول، کلب وغیرہ کا معقول انتظام تھا۔

ہمارے خوبصورت سے بنگلے کے اردگرد میکسیکن گھاس کا ہرا بھرا لان بنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ کیاریوں میں رنگ برنگے وخوش نما پھول کھلے رہتے جن پر لاتعداد تتلیاں منڈلایا کرتیں تھیں۔ مخملی گھاس پر تتلیوں کے پیچھے دوڑنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ اگتے سورج کی نرم دھوپ، سرمئی بادل، بارش کی رم جھم، افق پر چھائی ہوئی ڈوبتے سورج کی لالی، دودھیا چاندنی میری تنہائی میں خوبصورت رنگ بھرنے کے لیے کافی تھے۔

بنگلے کے چاروں طرف مضبوط لوہے کی خاردار باڑھ لگائی گئی تھی۔ بڑے سے آہنی گیٹ پر بندوق سے لیس ایک باوردی چوکیدار چوبیسوں گھنٹے تعینات رہتا تھا۔ باڑھ کے اس پار گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا جو جنگلی جانوروں سے پُر اور بے حد خطرناک تھا۔ میری دادی ماں ہمیشہ متنبہ کرتی رہتیں۔ ''بٹیا اکیلی باہر مت جانا.... شام ڈھلے تو ہرگز نہیں۔''

مشہور تھا کہ اس جنگل میں بیشمار خونخوار جانوروں کے علاوہ ریچھوں کی بھرمار ہے۔ دادی ماں کا ماننا تھا کہ ریچھ عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ ان کے نظریئے کو مزید تقویت ملتی جب گم شدگی کی رپورٹ پر جنگل میں تلاشی کے دوران عموماً کسی عورت کی لاش ریچھ کی کچھار سے برآمد ہوتی۔ اس کے بدن پر نوچ کھسوٹ اور ناخون کی خراش کے نشان ملتے۔ مجھے ریچھوں کے نام سے بھی خوف آتا تھا۔ اسکول کو محکمہ جنگلات کی بند جیپ گاڑی میں جایا کرتی تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے گاؤں کی عورتیں دادی ماں سے ملنے کے لیے اکثر ہمارے یہاں آیا کرتی تھیں۔ شریفہ آنٹی کی آمد ہمیشہ میرے لیے پریشان کن ثابت ہوتی تھی کیونکہ ان کے ساتھ ان کا ایک پوتا بھی ہوا کرتا تھا جو بے حد نٹ کھٹ اور شریر تھا۔ کیاریوں میں لگے پھول بلاوجہ توڑ کر پھینک دینا، چمن میں اڑ رہی خوبصورت تتلیوں کو پکڑ کر ان کے پر نوچ لینا اس کے پسندیدہ مشغلے تھے۔ غرض جب بھی آتا نت نئی شرارتوں سے تنگ کر کے رکھ دیتا۔ اس دن دیکھتے دیکھتے میری سب سے پیاری کانچ کی گڑیا لے کر زمین پر پٹخ دی۔ گڑیا چھن سے ٹوٹ گئی تو وہ ہنس پڑا تھا۔ اپنی گڑیا کے ٹوٹے ہوئے اعضاء کو لے کر میں کتنا روئی تھی۔

آخر کار زچ ہو کر دادی ماں کو کہنا پڑا۔ '' بچے فطرتاً شریر ہوتے ہیں۔ ان کو کھلی چھوٹ دینے کے بجائے وقتاً فوقتاً نصیحت کر کے بے جا

شرارتوں سے باز رکھنا ان کے اپنے مستقبل کے لیے مفید ہے۔ یہ توڑ پھوڑ، مار پیٹ اچھی علامتیں نہیں ہیں۔ اس سے تخریبی رجحان کی بو آتی ہے۔ اسے بھلے برے اور صحیح غلط کے بارے میں آگاہ کرنا تمہارا فرض بنتا ہے۔''

''مرد بچہ ہے...... ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ شرارتی بچے ذہین ہوتے ہیں۔'' شریفہ آنٹی کا جواب تھا.....

دادی ماں نے فوراً سرزنش کی..... ''معصوم ذہنیت کو اگر صحیح سمت نہ ملے تو آگے چل کر اس کا غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو...... گڑیا سے کھیلنے کے بجائے اسے پٹخ کر توڑ دیا!''

شریفہ آنٹی طنزیہ ہنستے ہوئے بولیں.....''اے ہے یہ گڑیا سے کیوں کھیلے گا بھلا! لڑکوں کو اتنا نرم مزاج بنانے لگے تو ہو چکا..... آگے چل کر زنخوں کی فوج تیار ہوگی۔''

پلّا چھڑا کر جاتی ہوئی شریفہ آنٹی سے دادی ماں نے بہ آواز بلند کہا۔''میری ایک بات گرہ باندھ لو۔ اگر اسی طرح بے جا شہ دی جاتی رہی تو آگے چل کر نا سمجھوں اور ظالموں کی فوج تیار ہوگی۔''

پھر اپنے سامنے موجود عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں:'' آج کے بچے کل کے شہری ہیں۔ اگر شروع سے ان کے دلوں میں بڑوں کی عزت، چھوٹوں سے پیار، کمزوروں پر رحم وکرم، عورت کا احترام، خاندان کی عزت وناموس کا احساس اور خوفِ خدا نہ پیدا کیا گیا تو مستقبل میں یہی بچے نوجوانی کی طاقت وخمار میں معاشرے پر قہر بن کر ٹوٹیں گے۔ اپنے وطن اور ماں بہنوں کی عزت کے رکھوالے نہیں بلکہ اسے تار تار کرنے والے ثابت ہوں گے اور پھر انھیں روکنا ناممکن ہوجائے گا۔ اولاد کو اچھے اخلاق کے علاوہ اعلیٰ تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کرنا ایک ماں کا پہلا فرض ہے ورنہ اس کا اپنا خون سماج کے لیے ناسور بن جائے گا۔ محبت ومروت کی آبیاری سے سخت سے سخت ترین دلوں میں بھی پیار اور انسانیت کے پھول کھلائے جاسکتے ہیں..... تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ایک طاقت ور شہنشاہ نے راکھی کے نام پر محض ایک کچا دھاگہ اپنی کلائی پر بندھوا کر ایک مجبور اور بے بس رانی کو اپنی منہ بولی بہن بنالیا تھا اور تادم زیست دشمنوں سے اس کی حفاظت کی قسم کھائی تھی...... نہ جانے کہاں گئے وہ لوگ! کہاں اوجھل ہوگئیں وہ انسانی قدریں، وہ سچے جذبے! شریفہ جیسی نادان عورتوں نے بچوں کو مناسب وقت پر صحیح تعلیم نہ دے کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اولادِ نرینہ کے زعم میں مرد کو کمزوروں کا محافظ نہیں بلکہ قہر وغضب کا پتلا بنا کر رکھ دیا ہے جو عورت ذات کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھنے کے بجائے صرف سامانِ عیش سمجھنے کی سوچ رکھتا ہے۔''

ان کے درمیان ایک اسکول ٹیچر بھی تھیں۔ وہ بولیں۔'' آپ نے سو فیصدی درست کہا، درس گاہ بچے کو تعلیم یافتہ بناتی ہے ماں کی تربیت اسے انسان بناتی ہے۔ آج حوا کی بیٹیوں پر ہورہے ہولناک مظالم کے لیے عورتیں بھی ذمہ دار ہیں۔ اکثر عورت نے عورت کے حق میں کانٹے بوئے ہیں۔ کبھی جہیز کے لالچ میں بیٹے اور شوہر کے ساتھ مل کر کسی کی نورِ چشم کو زندہ جلا دیا ہے تو کبھی اپنے فرض کے تئیں کاہلی اور چشم پوشی کرتے ہوئے لڑکے کو درندہ صفت بنا کر معاشرے میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔''

•••

اسی ڈر کے سائے میں پل کر میں بڑی ہوئی۔ ماں بچپن میں ہی گزر گئی تھیں کچھ عرصہ بعد دادی ماں بھی نہیں رہیں۔ میرے پاپا کی ترقی ہوئی اور ان کی پوسٹنگ شہری علاقے میں ہوگئی۔ یہاں آکر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو ہر آن ریچھوں کے خطرے سے تو نجات ملی۔

ایک مقامی کالج میں میرا داخلہ ہوگیا۔ آزاد کھلی ہوا میں میرا پہلا قدم۔ میں اپنی دو پہیہ گاڑی پر بے خوف وخطر کالج جانے لگی۔ وہ میری زندگی کے خوبصورت ترین دن تھے۔ نوجوانی کی معصوم ترنگ اور ولولے سے بھرپور منصوبے، زندگی میں کچھ کر دکھانے کا عزم، دل میں اپنے پاپا کا نام روشن کرنے کا مظبوط ارادہ جاگزیں تھا۔ نظریں ستاروں پر اور پاؤں بادل پر تھے۔ نوعمری کے بھولے پن میں ایک انوکھے احساسِ تحفظ کے زیرِ اثر مجھے ہر مقام مانوس ہر فرد بے ضرر اور اپنا سا لگتا تھا۔

پاپا اکثر کہتے تھے..... ''بیٹا سنبھل کر جانا۔ کہو تو میں تمھیں اپنی گاڑی میں ڈراپ کردوں گا اور شام کو لینے بھی آجایا کروں گا۔''

میں ہنس پڑتی .... ''ارے یہ کوئی جنگل تھوڑی ہے! مہذب انسانوں کا علاقہ ہے۔ یہاں ڈر کیسا!''

آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ اکثر کچھ ہیولے میرا پیچھا کرتے ہیں ان کی آنکھوں میں حیوانوں کی سی درندگی جھلکتی ہے! میں نے سوچا...... شاید ریچھوں کے علاقے میں پلی بڑھی ہونے کا اثر ہے، جس کی وجہ سے مجھے ہر چہرے میں وہی شبیہ دکھائی دیتی ہے!

اکثر ان چہروں پر بھی یہی جذبات دکھائی دیتے جن سے ہر دن سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ کچھ معزز ہستیاں جن کا میں بے حد احترام کرتی تھی، ان کی نظروں سے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ لباس کے پیچھے چھپے ہوئے میرے بدن کا جائزہ لے رہے ہوں۔ اس عجیب صورتحال پر میں بوکھلا جاتی۔ راہِ فرار یا جائے پناہ کی جستجو میں بے سود ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

•••

اس دن کالج فیسٹیول تھا۔ختم ہوتے کافی دیر ہوگئی۔ میں نے اپنے ایک کلاس فیلو سے کہہ رکھا تھا کہ واپسی میں اکٹھے چلیں گے کیونکہ ہمارا گھر اسی راستے میں پڑتا تھا جدھر اسے جانا تھا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم دونوں بے فکری کے ساتھ ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

سڑک کے کنارے لگے ہوئے برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا، چلتے چلتے سڑک کا وہ حصہ آگیا تھا جو قدرے ویران رہتا تھا سورج ڈھلنے کے بعد تو بالکل سنسان ہو جاتا۔ انتظامیہ کے ذریعے اس جگہ دور دور تک کوئی برقی قمقمہ بھی نہیں لگوایا گیا تھا۔

ناگاہ سامنے سے آتی ہوئی ایک کار کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں ہم دونوں نہا گئے۔ آنکھیں چندھیا گئیں اور گاڑیوں کو بریک لگانا پڑا۔ کار بھی روک دی گئی تھی لیکن ہیڈ لائٹس آن تھے۔ کار کے اندر سے تین افراد لڑکھڑاتے ہوئے اترے۔ ان میں سے ایک نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ کر اپنا قوی ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا، دوسرے بازو پر مجھے گڑیا کی طرح اٹھا لیا اور کندھے پر ڈال کر کار کی طرف چل پڑا۔ چشم زدن میں سب کچھ ہو گیا تھا۔ میں مزاحمت تو کیا کرتی، مارے خوف کے میری گھگھی بندھ گئی تھی اور ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے۔ پیچھے سے ہاتھا پائی کی آوازیں آرہی تھیں۔ معاً میرے ساتھی کی ایک زوردار چیخ اس سناٹے میں گونجی پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ آنے والا وقت بہت ذلت آمیز اور صبر آزما تھا۔

•••

میں کانچ کی گڑیا کی مانند ٹوٹی پھوٹی حالت میں بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہوں۔ میرے اردگرد موجود خدمت گاروں کی آپس کی بات چیت سے پتہ چلا ہے کہ ہر اخبار و نیوز چینل میں اسی ہولناک حادثے کا تذکرہ ہے۔ ملک بھر میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی ہے۔ پولیس کی غیر ذمہ داری کے لیے ان پر لعن طعن کے تیر برسائے جارہے ہیں۔ سرکاری حکام کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کے لیے لوگ مجبوراً سڑکوں پر اتر آئے ہیں۔ خصوصاً عورتوں کے لیے مزید حفاظتی تدابیر لاگو کرنے اور قانون کو سخت سے سخت تر بنانے کی سمت فوری طور پر قدم اٹھانے کی مانگ کی جارہی ہے۔ شہر کے سارے تعلیمی ادارے ویران پڑے ہوئے ہیں۔ ہراساں و پریشاں طالب علم اسپتال کے احاطے میں اپنی ساتھی کی درگت پر غم وغصے کے عالم میں مظاہرہ کر رہے ہیں۔ عبادت گاہوں میں میری سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جارہی ہیں۔

لاتعداد مشینوں میں گھرا ہوا میرا جسم درد کے بے کراں سمندر میں غوطے کھاتا سن ہوکر بے حس وحرکت ہو چکا ہے۔ موت بھی کمبخت لمحہ بہ لمحہ میری طرف بڑھ رہی ہے۔...... ایک جست میں آ کیوں نہیں جاتی؟ آہ...... میرا دماغ جاگ رہا ہے اور چلا چلا کر پوچھ رہا ہے......" آخر کیوں ، میرا قصور کیا تھا؟ یہی نا کہ میں ایک عورت ہوں! کمزور بے ضرر سا کھلونا ......کوئی یہ کیسے بھول سکتا ہے کہ اسے دنیا میں لانے والی ایک عورت ہی تھی ایک کمزور گوشت کے لوتھڑے کو اپنے لہو سے سینچ کر کڑیل جوان بنانے والی .....اوہ......فون کی گھنٹی بج رہی ہے ...... منتری کا فون آیا ہے کہ کسی بھی قیمت پر لڑکی کی جان بچانی ہوگی ورنہ اس کی پارٹی کی ساکھ خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ کرسی نشیں حکام! قلعہ نما سرکاری بنگلوں کے اندر شب و روز مسلح گارڈز کی نگرانی میں رہنے والے آخر کب تک بے ضرر شہریوں کی زندگی کو داؤ پر لگاتے رہیں گے؟ اف.....! انہیں غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے اور کتنی درد بھری چیخیں درکار ہوں گی؟

میں پوچھتی ہوں میری جان بچانے کا کیا جواز ہے؟ کوئی قانون کا رکھوالا میری معصوم ہنسی، میرا حوصلہ، میرے سپنے ...... میرا کھویا ہوا وقار لوٹا سکتا ہے؟ آیا کسی کی موت مجھے وہ سب کچھ واپس دلوا سکتی ہے؟ میرے مجرموں کو اگر پھانسی کی سزا ہوگئی تو کیا فائدہ ..... ہاں! اس سے دوسروں کو کچھ عبرت حاصل ہوگی ...... لیکن مقدمہ تو مہ و سال چلتا ہے .... دریں اثنا وہ کسی کے سایہ عاطفت کے آسرے بری بھی ہو سکتے ہیں! میری رائے میں ان کو سرِ عام زندہ جلا دینا چاہیے۔ میرے پاپا حملہ آور ریچھوں کو آناً فاناً گولی سے اڑا دیا کرتے تھے ...... میرے مجرم انسان ہیں مگر وحوش کے متلاشی ہوس کے غلام...... انھیں کسی درندے کا نام دینا درندوں کی نسل کو ذلیل کرنے کے مترادف ہے۔

کاش! دنیا کی ساری عورتیں میری دادی ماں جیسی ذمہ دار و دور اندیش ہو جائیں اور اس ازلی و دوامی حقیقت کا اعتراف کر لیں کہ....

"بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہے۔"

□□□

Shahida Shaheen
371,6th Cross
Opp. Nehru Park
Udayagiri
Mysore-570019 (Karnatak)

ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ)

شگفتہ باجی

زندگی بڑی طویل بھی ہے اور بہت مختصر بھی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

دنیا کے سمندر میں انسان کی زندگی کی کشتی کتنی دور جائے گی، منجدھار میں پھنس کر رہ جائے گی، یا پھر کشتی کو ساحل تک لے جانے کے لیے نہ جانے کتنے نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑے گا، معلوم نہیں۔ انسان کو جب اپنی زندگی کی کشتی کو ڈوبنے کا اندازہ ہونے لگتا ہے تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ کسی بھی طرح سے اس کی کشتی ڈوبنے نہ پائے۔ مگر یہ بھی کڑوی سچائی ہے کہ ڈوبنے والے کو بچانے کے لیے کوئی اپنی جان کی بازی لگا دے، آج ایسے لوگ نہیں رہے۔ بہرحال ڈوبنے والا سوچ لیتا ہے کہ اب تو اسے ڈوب ہی جانا ہے۔ یہ سچی کہانی اس خاتون کی زندگی کی حقیقت ہے جو آج کے سنگ دل لوگوں کی نگاہوں کا شکار ہے۔ وہ چاہے اپنا خون ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ اپنے رشتہ دار اور قریبی ہی کیوں نہ ہوں یا اپنے دوست واحباب ہی کیوں نہ ہوں کوئی بھی مدد کے لیے نہیں بڑھتا۔ افسوس صد افسوس! یہ ایک ایسی خاتون کی حقیقت ہے جس کا نام شگفتہ فاطمہ ہے۔ پورے محلے کی لڑکیاں اس کو 'شگفتہ باجی' کہتی ہیں کیونکہ وہ تمام لڑکیوں میں جن میں دس سال کی عمر سے لے کر پچیس سال تک کی لڑکیاں ہیں۔ ان میں شگفتہ باجی ہی سب سے بڑی ہیں۔ جب شگفتہ باجی کو دیکھا تو صرف ایک سال ہوا تھا ان کی شادی کو۔ شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی اور بڑی دھوم دھام سے۔ عیش و آرام میں بھی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کیوں شگفتہ باجی کو ایک دو بار ہی سسرال جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی دولھا بھائی کبھی ان کے ساتھ نہیں آئے۔ محلے کی لڑکیاں ان سے پوچھتیں۔ کیوں شگفتہ باجی دولھا بھائی...... دیکھئے اگلی بار آپ اکیلی نہیں آئیں گی۔ ہم اتنی سالیوں کے تو ایک ہی دولھا بھائی ہیں...... ہم سب مل کر انھیں خوب پریشان کریں گے۔ اتنا سن کر شگفتہ باجی صرف مسکرا دیتیں۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتی تھیں۔ شگفتہ باجی پانچ بھائیوں کی اکیلی بہن تھیں اور والد کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ کا ساتھ تھا۔ شگفتہ باجی والدہ اور بھائیوں کی بڑی لاڈلی تھی۔ خدا نے انھیں خوبصورت بھی بنایا اور تعلیم کی دولت بھی عطا کی۔ شگفتہ باجی ایم۔اے ، بی ایڈ تھی۔ شادی کے دو سال کے بعد ایک پیارا سا ننھا منا بھی آ گیا۔ مگر ننھے منے کی پیدائش کی خبر سن کر بھی دولھا بھائی نہیں آئے۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا جس کا اثر شگفتہ باجی پر برسوں رہا۔ ہم ساری لڑکیاں آپس میں باتیں کرتے اور کہتے بڑے برے ہیں دولھا بھائی...... کبھی آتے ہی نہیں۔ پھر دو تین سال، دس بارہ سال گزر گئے۔ شاہ رخ بھی پورے دس سال کا ہو گیا، مگر دولھا بھائی نہ آئے۔ شگفتہ باجی کی آنکھیں انتظار میں اداس سی رہنے لگیں۔ ان کی وہ ہنسی، ہم سب کے ساتھ مل کر قہقہے لگانا سب ختم ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور سمجھنے لگیں۔ اس دور میں کوئی کسی کا ہمدرد بھی نہیں ہوتا اور کوئی ایسا نظر ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اکھڑی سانسوں کو جینے کی آرزو دے سکے۔ ان کی مایوسیوں کو کم کر سکے۔ اچانک جب یہ معلوم ہوا کہ دولھا بھائی نے تو لکھنؤ میں ہی دوسری شادی ایک بڑی کمسن لڑکی سے کر لی جسے وہ پہلے ہی سے چاہتے تھے۔ تو اس خبر کے ملتے ہی گھر میں ماتم چھا گیا۔ در و دیوار اداس اور ہر کوئی مایوس اور بے بس نظر آنے لگا...... ہائے اللہ

اب شگفتہ......اب شگفتہ باجی کا کیا ہوگا؟

شگفتہ باجی نے بھی دل میں یہ طے کرلیا کہ اب تو انتظار بھی ختم۔ اب زندگی کی طویل سفر تنہا ہی طے کرنا ہے جو ایک عورت کے لیے بیحد مشکل ہوتا ہے۔ چاہے یہ سفر کتنا ہی پیچیدہ اور خطروں سے کیوں نہ بھرا ہو۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ لوگوں کے دلوں سے ہمدردی اور محبت کا جذبہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہر انسان کو اپنی فکر ہے۔ ایسے ماحول نے رشتوں کے بندھن کو بھی کمزور کردیا ہے۔ بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں، وہ اپنی ذمہ داریوں میں مصروف رہنے لگے بلکہ ملازمت کی وجہ سے الگ الگ شہروں میں جا بسے۔ شگفتہ باجی تنہا رہ گئیں۔ محلے کی تمام لڑکیوں کی شادیاں ہوگئیں۔ وہ اپنے اپنے سسرال چلی گئیں۔ شگفتہ باجی سلائی، کڑھائی کے کاموں میں مصروف رہنے لگیں۔ صبح اٹھتے ہی سوئی دھاگا ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ رات میں جب تک نیند نہیں آجاتی، کام کرتی رہتیں۔ شاہ رخ بھی بڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے ابا کو دیکھا نہیں، ابا کے پیار سے محروم رہا۔

"شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی اور بڑی دھوم دھام سے۔ عیش و آرام میں بھی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کیوں شگفتہ باجی کو ایک دو بار ہی سسرال جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی دولہا بھائی کبھی ان کے ساتھ نہیں آئے۔ محلے کی لڑکیاں ان سے پوچھتیں۔ کیوں شگفتہ باجی دولہا بھائی...... دیکھئے اگلی بار آپ اکیلی نہیں آئیں گی۔ ہم اتنی سالیوں کے تو ایک ہی دولہا بھائی ہیں...... ہم سب مل کر انہیں خوب پریشان کریں گے"

اچانک ایک روز ایک آدمی کچہری سے کچھ کاغذات لے کر آیا۔ معلوم ہوا کہ شاہ رخ کو بذریعہ کورٹ لینے کے لیے اس کے والد نے درخواست دی ہے......اس میں درج تھا کہ اگر شاہ رخ نے کہہ دیا کہ "میں والد کے ساتھ رہوں گا تو یہی فیصلہ آخری ہوگا......شگفتہ باجی کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ ہم بس اندازہ ہی لگا سکتے ہیں۔ شاہ رخ کو سمجھایا جانے لگا کہ بیٹا تم کو وہاں کیا کہنا ہے۔ تم اپنی بے بس ماں کا اکلوتا سہارا ہو جنھوں نے دن کا چین اور راتوں کی نیندیں ختم کرکے تمھاری پرورش کی ہے۔ بہرکیف شاہ رخ والد کی محبت سے ہی محروم ہے تو اسے ماں کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ آخر کار کورٹ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ شاہ رخ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہے گا......مگر انسان آخر غم کب تک برداشت کرسکتا ہے۔ شگفتہ باجی کا دماغ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا کہ ہمیں زندگی نے کیا دیا، غم، مایوسی، بے بسی، ناکامی، نفرت، تڑپ، بے وفائی اور نہ جانے کیا کیا۔ تنہائی ہی ان کی ساتھی ہے۔ وہ شاہ رخ کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے بہت محنت کرتیں۔ باریک کام کرنے سے ان کی آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی۔ اب وہ اور دوسری ضرورت مند لڑکیوں کا سہارا لے کر کام کرنے لگیں۔ غم برداشت کرتے کرتے ان کی یادداشت بھی کم ہونے لگی۔ نیند بھی آنے لگی۔ جب ایک بار طلاق کے مقدمے کے سلسلے میں کچہری گئیں۔ جو جان پہچان کے لوگ تھے وہ افسوس کرنے لگے کہ شگفتہ کی یہ حالت ہوگئی۔ خدا کسی کو غم دے مگر اتنا نہیں کہ وہ اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھے......اب شاہ رخ بڑا ہوگیا ہے۔ اس کی شادی ہوگئی مگر اس وقت شگفتہ باجی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ وہ ایک تماشائی کی طرح اپنے بیٹے اور بہو کو دیکھ رہی تھیں۔

ان کی ساری زندگی کی محنت کا یہ صلہ ملا کہ وہ اپنے بیٹے بہو کو ہی نہ پہچان سکیں۔ بیٹے سے ہی پوچھتی ہیں کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟

اب تو شگفتہ باجی کی زبان سے الفاظ بھی صاف ادا نہیں ہورہے تھے۔ کھانا کھانا بھی بھول چکی تھیں۔ سارا دن چلتی رہتی ہیں چلتے چلتے کمر جھک گئی ہے۔ درد شدید ہوتا ہے مگر انھیں احساس ہی نہیں کہ کیا ہورہا ہے۔ کہنا بہت کچھ چاہتی ہیں مگر الفاظ منہ سے پورے نہیں نکلتے۔ نیند کی گولی کا اثر بھی اب ان پر نہیں ہوتا۔ رات میں آکر دو گھنٹے سوگئیں تو والدہ کو خوشی ہوئی کہ آج شگفتہ کو تھوڑی نیند آئی۔ یہی روز کا حال ہے۔ والدہ بیحد بوڑھی ہوچکی ہیں مگر وہ ان کے آگے پیچھے ہمیشہ لگی رہتی ہیں۔ اب تو ان پر دوا کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ شگفتہ باجی کی حالت اب تو دیکھی نہیں جاتی۔

یہ سچ ہے کہ غم انسان کے حصے میں آتا ہے پھر ایسا بھی نہیں کہ دکھوں کے سوا خوشی ہو ہی نہیں پھر ایسی زندگی سے کیا حاصل۔

شاید شگفتہ باجی کی تلخیوں کو شیرینی میں بدلنے کا انتظار تھا کہ اس طوفانی رات میں زندگی کی کشتی کو ساحل مل جائے۔

□□□

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Assistant Professor
Head Dept. of Urdu
28/390, Binda Ganj
Gudri Mansoor Khan
Agra-282003 (U.P)

ڈاکٹر ریشا قمر

متاعِ زیست

گڈی کی شادی کا ہنگامہ تھا اس کے کمرے میں سبھی رشتہ دار اور سہیلیاں جمع تھیں۔
شام قریب تھی رخصتی کا وقت بھی قریب تھا اور وہ تصویر کو سینے سے لگائے سوچ رہی تھی۔ آج تو ہر چیز اس کے پاس تھی۔ زندگی کا ہر سکھ اس کے دامن میں تھا اور ان خوشیوں کا بدل کسی صورت واپس نہیں آسکتا تھا۔ یہ سارے سکھ عیش وعشرت والی زندگی اس ایک چیز کا مداوا نہیں کر سکتے تھے اور وہ ایک کمی ہر خوشی کو ادھورا کر رہی تھی کاش کہ وہ قیامت جیسے لمحے ہماری زندگی میں آئے ہی نہ ہوتے۔

دولت کبھی محبت کا بدل ہو بھی نہیں سکتی جو ہماری اصل دولت تھی وہ لٹ چکی تھی۔۔ بھائی۔۔ گڈی کے آنسو روانی سے بہنے لگے۔۔ بھائی۔۔ کہاں ہے تو۔۔۔ تیرے بنا کیسے اس بے چین دل کو قرار آئے گا۔

گڈی۔۔۔ کے آنسو اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے اس وقت کو یاد کرنے لگی۔۔ گڈی۔۔ بھائی اٹھ جاؤ۔۔ وہ بار بار آواز دے رہی تھی ساتھ ساتھ کام بھی نپٹا رہی تھی۔۔

رحمت ابھی گہری نیند میں تھا کہ برتنوں کی اٹھا پٹخ سے کان جھنجنا اٹھے اور وہ بوجھل آنکھیں لیے اٹھ بیٹھا جیسے ہی آنکھیں کھلیں ذہن بیدار ہوا اور پھر سے وہی سوچ حاوی ہونے لگی کہ کتنے دفتروں کے دھکے کھاتا ہے اور نہ جانے آج بھی کہاں کہاں جانا پڑے اور ویسے بھی رحمت کے پاس ان دفتروں کے دھکے کھانے کے علاوہ کوئی اور کام بھی نہیں تھا تبھی رحمت کی ماں نے آواز دی۔

بیٹا اٹھ جاؤ! آج لڑکے والے گڈی کو دیکھنے آنے والے ہیں پہلے منہ ہاتھ دھو کے بازار سے مہمانوں کے لیے کچھ لیتا آ۔ یہ رشتہ ہو جائے تو میرے سر سے ایک بوجھ ہٹے۔ بیٹی تو رحمت ہے مگر آج بوجھ ہوگئی ہے ایک تو غریبی اوپر سے بے روزگاری پھر لڑکے والوں کی مانگ۔۔۔ ایسا لگتا ہے بیٹی زحمت ہے۔ رحمت کی ماں بیٹی کے رشتے کے لیے بہت پریشان ہے۔

امجد کہتا ہے۔۔۔ بھائی آج میری بھی فیس بھرنی ہے ورنہ مجھے کالج سے نکال دیا جائے گا بھائی آخر کب تک ہم یوں ہی مجبوری کی زندگی گزاریں گے۔ کب تمہاری نوکری لگے گی کب ساری پریشانیاں ختم ہوں گی۔۔ مجھے لگتا ہے تمھیں تو نوکری ملنے سے رہی۔۔۔ ہماری پھوٹی قسمت

نہ جانے کب جاگے گی۔

رحمت کی ماں ۔۔ کہتی ہے بیٹا چپ ہوجا اس کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں ۔ ہمارا اندھیرا بھی دور ہوگا ہمارا اللہ اپنی رحمت سے سب اندھیروں کو اجالوں میں بدل دے گا۔۔ بھروسہ رکھو۔

رحمت ۔۔ بھائی کی باتوں سے مغموم ہوجاتا ہے منہ دھوتے ہوئے کہتا ہے ۔۔ میں کیا کروں اماں! کیسے سمجھاؤں امجد کہ یہ براوقت تھوڑے دن کا مہمان ہے ۔ دیر سویر گذر جائے گا ہمارے بھی اچھے دن آئیں گے حالات بدلیں گے۔

میں ہر روز سڑکوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تو نوکری لگ ہی جائے گی ۔ ماں آج کل رشوت کا زمانہ ہے نہ میرے پاس پیسے ہیں نہ سفارش ماں ۔۔۔ تو نہیں جانتی آج ان دونوں کی بہت ضرورت ہے ۔ قابلیت اور صلاحیت سے کچھ ہونا بہت مشکل ہے۔

گڈی ۔۔۔ ماں اور رحمت کی باتیں بڑے دھیان سے سنتی ہے اور کہتی ہے کہ بھائی کو کیا خاک نوکری ملے گی ۔ آج پیسہ ہی سب کچھ ہے، ماں تیرا بیٹا بہت ہی لائق ہے، قابل ہے ۔ مگر آج کل لوگ اس قابلیت کا اچار ڈالتے ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ لوگوں میں نہ ایمانداری باقی ہے نہ مروت وخلوص ۔۔ سچ پوچھو نہ ماں تو آج کی دنیا میں یہ پیار محبت، ہمدردی سب کتابی باتیں ہیں اور ان کے بغیر تم دونوں یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔

ماں ۔۔۔ کہتی ہے ایسا نہیں کہتے بیٹا گڈی تو چپ ہوجا ۔۔۔

رحمت ۔۔ کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ اس بے کاری سے خود کو بے بس ولاچار محسوس کرنے لگتا ہے ۔۔ اور کہتا ہے دھوکہ دہی ، رشوت خوری اور بے ایمانی سے مجھے نوکری نہیں چاہیئے ۔ مجھے اپنی تعلیمی قابلیت اور اپنی صلاحیت سے نوکری حاصل کرنی ہے ورنہ اتنی پڑھائی کا کیا فائدہ؟ میں نے بہت محنت ومشقت سے یہ ایم بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے تاکہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پال سکوں تم سب کو ایک اچھی زندگی دے سکوں ۔۔ یہ چاپلوسی اور رشوت خوری کے لیے نہیں ۔۔۔ مگر گڈی میں کیا کروں نہ قسمت ساتھ دے رہی ہے اور نہ ہی قابلیت ۔۔

گڈی ۔۔ میری پیاری بہنا ۔۔ میری نوکری لگتے ہی تیرا بیاہ ایک اچھے گھر میں کردوں گا امجد کو خوب پڑھاؤں گا اور انجینئر بناؤں گا ۔ ماں کو ایک اچھی زندگی دوں گا ۔۔ ماں نے آج تک زندگی کا کوئی سکھ نہیں دیکھا ہے ۔۔ میں سب کچھ کروں گا ۔۔

ماں تو جانتی ہے نا میں ہر روز ایک نئی کوشش کرتا ہوں اور ناکام ہوجاتا ہوں ۔۔ میں کیا کروں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں ۔۔ پر ہر کوشش ناکام ہوجاتی ہے۔

ماں تو آخر ماں ہوتی ہے جو موم سے نازک جذبات رکھتی ہے ۔ ذرا سی بات سے پگھل جاتی ہے اور رحمت کی ماں بھی بیٹے کو تسلی اور دلاسے دیتی ہے صبر کر بیٹا ۔۔ بہن بھائی کی بات کو دل سے مت لگا براوقت ہے گزر جائے گا یہ بھی ہمارے صبر کا امتحان لیتا ہے ۔ تو ہمت مت ہارنا میرے بچے ۔۔۔

”ماں تو آخر ماں ہوتی ہے جو موم سے نازک جذبات رکھتی ہے ۔ ذرا سی بات سے پگھل جاتی ہے اور رحمت کی ماں بھی بیٹے کو تسلی اور دلاسے دیتی ہے صبر کر بیٹا ..بہن بھائی کی بات کو دل سے مت لگا برا وقت ہے گزر جائے گا یہ بھی ہمارے صبر کا امتحان لیتا ہے ۔ تو ہمت مت ہارنا میرے بچے...“

رحمت ۔۔۔ ماں کے ہاتھ چومتے ہوئے کہتا ہے میں بھی تو یہی سوچتا ہوں اور روز ایک نئے عزم کے ساتھ گھر سے نکلتا ہوں کہ آج مجھے میری منزل ملے گی اور ناکام گھر لوٹتا ہوں ۔۔

ماں ۔۔ میری ماں مگر تیری یہ باتیں میری ہمت اور بڑھاتی ہیں اور میں پرسکون ہوجاتا ہوں ۔۔ رحمت ۔۔ بہت کچھ دل میں چاہ لیے ماں سے کہتا ہے ماں میں چلتا ہوں دعا کرنا آج میری کوئی نوکری لگ جائے میں خوشخبری کے ساتھ ہی گھر آؤں ۔۔

ماں ۔۔۔ کہتی ہے پر بیٹا آج گڈی کو دیکھنے لڑکے والے آرہے ہیں ایسے وقت بھی اگر تو گھر نہ رہے تو اچھا نہیں لگتا۔

ماں تو امجد سے مہمانوں کے لیے کچھ منگوالینا میں شام کو نوکری کی خوش خبری کے ساتھ ہی گھر آؤں گا اتنے میں گڈی دوڑتے ہوئے آتی ہے اور کہتی ہے بھائی کھانا کھا کے جانا غصہ سے پیٹ نہیں بھرتا چل پہلے کچھ کھا لے پھر چلے جانا ۔۔

رحمت ۔۔۔ مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے اگر لگی تو باہر کھالوں گا تو پریشان مت ہونا ماں کے ساتھ کھانا کھالینا ۔۔۔ میں چلتا ہوں ۔۔۔

رحمت بہت پریشانی اور مایوسی کی حالت میں گھر سے نکلتا ہے راستے میں آصف سے ملتا ہے جو اس کے بچپن کا واحد دوست ہے جو اس کی گھریلو پریشانیوں اور مالی حالت سے بخوبی واقف ہے۔

آصف۔۔۔کیا ہوا؟۔۔۔رحمت بڑا پریشان لگ رہا ہے کوئی پریشانی ہے یا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔نہیں یار۔۔۔ایسا کچھ نہیں ہے۔

پھر کیا ہوا۔۔۔

کچھ نہیں یار۔۔۔

تیری صورت سے تو لگ رہا ہے تو بہت پریشان ہے۔۔۔

ہاں یار۔۔تو تو سب کچھ جانتا ہے میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا روز خود کو تسلی دیتے دیتے تھک چکا ہوں۔۔میری ماں روز نئے سپنے دیکھتی ہے ایک امید لگاتی ہے اور ہر شام وہ امید دم توڑ دیتی ہے۔۔

گڈی کی آنکھوں میں شادی کے خواب ہر صبح روشن ہوتے ہیں کہ اس کا بھائی اس کی شادی ایک اچھے گھر میں کرے گا اور ہر شام وہ خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

امجد کو تو تو جانتا ہے بہت ہی ذہین اور محنتی ہے اگر میں نے اس کی فیس نہیں بھری تو امتحان بھی نہیں دے سکے گا اور اس کے آگے کی تعلیم کا کیا ہوگا۔

تینوں جیسے ہی ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں وہاں لوگوں کی بھیڑ موجود ہوتی ہے رحمت کے دوست , آس پڑوس اور جان پہچان کے تمام لوگ وہاں جمع ہوجاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے بیچارہ کی عمر ہی کیا تھی یہ کیا ہوگیا۔۔اور وہ تینوں چپ چاپ چلتے ہوئے رحمت کے کمرے میں آتے ہیں اور ایسے چلتے ہیں گویا ان کے جسم میں کوئی جان باقی نہ ہو جیسے ہی قریب آتے ہیں ماں کی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔ بہن کی زبان گنگ ہوجاتی ہے اور امجد دھاڑیں مار مار کے رونے لگتا ہے ...

تو جانتا ہے آصف یہ تمام مسئلے میری نوکری سے ختم ہو سکتے ہیں یا پھر میری سانس کے ختم ہونے سے۔۔۔رحمت کی باتوں سے آصف بہت پریشان ہو جاتا ہے۔۔یار تو یہ کیسی ناامیدی کی باتیں کرنے لگا ہے ہمت سے کام لے تو ہی ان سب کا سہارا ہے اگر تو ہی ایسی باتیں کرنے لگا تو باقی کو سہارا کون دے گا۔۔دیکھنا ایک دن تیری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی بس میرے دوست تجھے امید نہیں چھوڑنی ہے۔۔۔

ہاں۔۔یار تو کہہ تو ٹھیک رہا ہے مگر اب میری ہمت ٹوٹنے لگی ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کیسے اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کروں۔

اچھا یار۔۔۔میں چلتا ہوں ایک جگہ نوکری کے لیے بلایا ہے آج شاید میری ہر پریشانی ختم ہوجائے گی۔۔رحمت۔۔۔آصف سے ملنے کے بعد سیدھے سڑک کے کنارے اپنی ہی سوچ میں گم چلنے لگتا ہے اور چلتے چلتے بیچ سڑک پر آجاتا ہے۔وہ اطراف واکناف سے بیگانہ اپنی دھن میں چلتا ہے اور دیکھتا ہے کہ دوسری طرف سے بہت ہی تیز رفتاری سے ایک ٹرک آرہا ہے اور وہ سڑک پر چل رہے ایک آدمی کو اڑا سکتا ہے وہ اس کو بچانے کے لیے جاتا ہے اس کو روڈ کی دوسری طرف دھکا دیتا مگر اس سے پہلے کہ وہ خود کو بچاتا وہ ٹرک کے نیچے آجاتا ہے اور اسے بس لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور پھر وہ ہوش وحواس سے بیگانہ اور ہر فکر سے آزاد ہوجاتا ہے۔

لوگوں کا ہجوم جمع ہوتا ہے۔۔اور رحمت کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے اور اس کے گھر بھی اطلاع دے دی جاتی ہے۔۔

امجد کو جیسے ہی پتہ چلتا ہے وہ گڈی سے کہتا ہے بھائی ہسپتال میں ہے اس کا accident ہوگیا ہے۔گڈی چیخ مارتی ہے اور زور زور سے رونے لگتی ہے اس کے رونے کی آواز سے ماں بھی پریشاں ہوکر آجاتی ہے اور گڈی سے پوچھتی ہے۔

گڈی۔۔کیا ہوا ہے تو کیوں ایسے رو رہی ہے جیسے کوئی مر گیا ہے۔

ماں۔۔وہ ماں سے لپٹ کر زاروقطار رونے لگتی ہے۔ماں بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔۔۔

ماں زاروقطار رونے لگتی ہے مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلتی ہے صرف آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں۔

تینوں جیسے ہی ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں وہاں لوگوں کی بھیڑ موجود ہوتی ہے رحمت کے دوست، آس پڑوس اور جان پہچان کے تمام لوگ وہاں جمع ہوجاتے ہیں۔کوئی کہتا ہے بیچارہ کی عمر ہی کیا تھی یہ کیا ہوگیا۔۔۔اور وہ تینوں چپ چاپ چلتے ہوئے رحمت کے کمرے میں آتے ہیں اور ایسے چلتے ہیں گویا ان کے جسم میں کوئی جان باقی نہ ہو جیسے ہی قریب آتے ہیں ماں کی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔بہن کی زبان گنگ ہوجاتی ہے اور امجد دھاڑیں مار مار کے رونے لگتا ہے۔۔۔

ماں۔۔کہتی ہے بیٹا رحمت اٹھ جاؤ میں نے تیرے لیے صبح سے کچھ نہیں کھایا تیرا انتظار کرتی رہی۔۔اب تو اٹھ جا میرے بچے۔۔

رحمت۔۔۔رحمت۔۔میرے بچے۔۔آنکھیں کھول۔۔

دیکھ تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔

اور روتے روتے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔۔

ہوش میں آنے کے بعد وہ خود کو گھر میں پاتی ہے آصف پاس بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے خالہ کچھ تو کھا لو پانی تو پی لو ہمیں رحمت کو اس کی آخری منزل تک پہنچانا ہے۔

اتنا سنتے ہی رحمت کی ماں پھر سے رونے لگتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے جب ہوش میں آتی ہے پھر آنسو بہنے لگتے ہیں اور ایک سایہ دکھائی دیتا ہے وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اس سایہ تک پہنچتی ہے اور آواز دینے لگتی ہے رحمت۔۔۔رحمت میرے بچے تو آ گیا۔۔

"اور وہ سایہ اس کی ماں کے پیروں میں بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے مجھے معاف کردینا میری جان بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی ہے میں آپ کے بیٹے کو تو واپس نہیں لاسکتا ..ہاں آج سے اس گھر کی تمام ذمہ داریاں میری ہیں ..ماں مجھے اپنا رحمت ہی سمجھنا ..میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے بس محبت کا مارا ہوں ..گڈی اور امجد اب میری ذمہ داری ہیں میں ان کی پڑھائی لکھائی اور شادی کروں گا ..یہ سب میرے ذمہ ہے۔۔"

اور وہ سایہ اس کی ماں کے پیروں میں بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے مجھے معاف کر دینا میری جان بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی ہے میں آپ کے بیٹے کو تو واپس نہیں لاسکتا۔۔ہاں آج سے اس گھر کی تمام ذمہ داریاں میری ہیں۔۔ماں مجھے اپنا رحمت ہی سمجھنا۔۔میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے بس محبت کا مارا ہوں۔۔گڈی اور امجد اب میری ذمہ داری ہیں میں ان کی پڑھائی لکھائی اور شادی کروں گا۔۔یہ سب میرے ذمہ ہے۔۔

رحمت۔۔میرا بچہ۔۔چل بیٹا کھا لے۔۔میرے بچے تو نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔۔یہی الفاظ دہراتی جاتی ہے تب گڈی کہتی ہے۔۔ماں ہوش میں آ۔۔۔ماں بھائی نہیں رہا ماں۔۔۔اور وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔

ماں کہتی ہے میرا بچہ کہاں چلا گیا تو آج کہہ کے گیا تھا ساری پریشانیاں ختم کر دوں گا آج تو نے ساری پریشانیاں ختم کر دیں۔۔۔بس نہ ختم ہونے والا غم دے گیا۔۔ہمارے جینے کا سب سامان دے گیا اور اپنی سانس کے ساتھ ہر پریشانی بھی ختم کر گیا۔۔۔

گڈی بیٹا تیار ہو نہ تم۔۔ماں کی آواز سنتے ہی گڈی حال میں لوٹ آتی ہے اور آنسو صاف کرنے لگتی ہے۔ماں۔۔۔جیسے کمرے میں داخل ہوتی ہے گڈی کو دلہن کے روپ میں روتے دیکھ کر اس کے قریب آتی ہے اور آنسو پونچھتی ہے۔

گڈی۔۔ماں۔۔بھائی کے بنا یہ سب ادھورا ہے ماں۔۔۔

اور دونوں مل کر رونے لگتے ہیں۔

اور ماں گڈی سے کہتی ہے دیکھ اللہ نے میرے رحمت کو مجھ سے چھین لیا مگر اپنی رحمت سے سب کچھ ٹھیک کر دیا۔

❑❑❑

Dr. Ramisha Qamer (Qamerunnisa)
Dept of Urdu and Persian
Gulbarga University
Laalaburagi-585106 Karnataka

طلعت سروہا

غزلیں

جو شخص تیرے غم میں بظاہر اداس ہے
وہ واقف سکوں ہے مسرت شناس ہے

اے مائلِ بہار کہیں یہ نہ بھولنا
ہر گلشن امید کا انجام یاس ہے

اٹھتی نہیں ہے جانب ارباب اقتدار
شاید میری نگاہ زمانہ شناس ہے

دامن پہ اشکِ غم ہیں گریباں لہو سے تر
اے صبح نو گلوں کا یہ کیسا لباس ہے

شاید اسی کا نام ہے مجبوری حیات
ٹوٹی ہوئی ہے آس مگر پھر بھی آس ہے

ٹکرا کے جس سے کتنے ہی طوفان پلٹ گئے
اے طلعت میری روح میں ایک ایسی پیاس ہے

آؤ رنگین نظارے دیکھو
داغ سینے کے ہمارے دیکھو

غمِ دوراں پہ مسکراتے نہیں
حوصلے دل کے ہمارے دیکھو

بچ کے طوفان سے سفینے کتنے
آ کے ڈوبے ہیں کنارے دیکھو

میرے قدموں پہ جھکے جاتے ہیں
کہکشاں، چاند ستارے دیکھو

میرے ارمانوں کا یہ شیش محل
کوئی پتھر سے نہ مارے دیکھو

وہ جو نظروں سے دور نہیں طلعت
دل میں رہتے نہیں ہمارے دیکھو

Talat Jahan Saroha
12/944 Daud Sarai
Saharanpur-247001(U.P)

لذیذ پکوان

ونٹرڈش مکسڈ ویجی ٹیبلز

اجزا: آلوایک پاؤ، مٹرایک پاؤ، شلجم ایک پاؤ، گاجرایک پاؤ، نمک ایک چائے کا چمچ، گوبھی ایک پاؤ، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، ٹماٹرایک پاؤ، ہلدی ایک چوتھائی چائے کا چمچ، پیاز دو عدد درمیانی، سرخ مرچ ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی، ہری مرچ کٹی ہوئی چند، کوکنگ آئل چار کھانے کے چمچ، ہرا دھنیا کٹا ہوا۔

ترکیب: پیاز کے سلائس کاٹ لیں۔ آلوؤں کا چھلکا اتار لیں اور ان کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں گاجر کاٹ لیں۔ شلجم کے بھی چوکور (کیوب نما) ٹکڑے بنالیں۔ گوبھی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ ٹماٹروں کا گودا نکال کر ان کو بھی چوکور (کیوب کی شکل) کاٹ لیں ایک پتیلی میں کوکنگ آئل گرم کریں۔ پیاز کو ہلکا فرائی کر لیں۔ اب اس میں مصالحوں کے ساتھ تمام سبزیاں ڈال دیں اور چمچ چلاتے ہوئے فرائی کریں۔ آدھا کپ پانی ڈال کر اس کا ڈھکنا ڈھانپ دیں اور دس منٹ تک پکنے دیں۔ اس وقت تک پکائیں کہ پانی خشک ہو جائے اور سبزیاں گل جائیں۔ چولہے پر سے اتار لیں اور ہری مرچ اور ہرے دھنیے سے گارنش کر کے سرو کریں۔

کھٹے میٹھے مچھلی کے کوفتے

اجزا: مچھلی آدھا کلو (بغیر کانٹے کے)، نمک حسب ذائقہ، کارن فلار 2 چھوٹے چمچ، ہری پیاز 2 عدد، ادرک آدھا چھوٹا چمچ، بند گوبھی 2 کپ، چکن کیوبز 2 عدد، ٹمامر کیچپ آدھا کپ، انڈا 1 سفیدی، سرکہ آدھا کپ، لیموں کا رس 2 چھوٹے چمچ، چینی آدھا کپ

ترکیب: مچھلی میں ادرک، نمک، پیاز، سفیدی اور لیموں کا رس ملا کر پیس لیں۔ اخروٹ کے سائز کے کوفتے بنالیں۔ 2 کپ پانی ابال کر کوفتے ڈالیں اور 5 منٹ پکائیں۔ تیل گرم کر کے بند گوبھی فرائی کریں اور نکال لیں۔ باقی تیل میں ٹماٹو کیچپ، سرکہ، چینی ڈال کر پکائیں۔ جس پانی میں کوفتے ابالے تھے وہ پانی ڈالیں اور پکائیں، تھوڑے پانی میں کارن فلاور گھول کر ڈالیں۔ گاڑھا ہو تو کوفتے اور بند گوبھی بھی ڈالیں۔ آخر میں ایک کپ گرم پانی میں چکن کیوبز گھول کر ملائیں۔ 5 منٹ پکا کر ڈش میں نکال لیں۔

چولائی کا ساگ

چولائی کا ساگ ایک کلو، تیل ایک چوتھائی کپ پیاز ایک عدد (کٹی ہوئی)، لہسن ایک کھانے کا چمچ (کٹا ہوا)، سفید زیرہ ایک چائے کا

چمچ (ثابت)، لال مرچ آٹھ عدد (ثابت)، ٹماٹر ایک عدد، نمک ایک چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ (کُٹی ہوئی)، آلو ایک عدد (کیوبز میں کٹا ہوا)

تیل گرم کر کے اس میں پیاز، لہسن، ثابت سفید زیرہ اور ثابت لال مرچ ڈال کر فرائی کریں، یہاں تک کہ پیاز نرم ہو جائے۔

اب اس میں ٹماٹر، آلو، نمک، کُٹی لال مرچ اور آدھا کپ پانی شامل کریں اور ڈھک کر پکائیں کہ آلو تقریباً تیار ہو جائیں۔

اب اس میں چولائی کا ساگ ڈال کر ڈھکیں اور اتنا پکائیں کہ وہ تیار ہو جائے۔

بھنڈی مصالحہ

بھنڈی آدھا کلو، تیل آدھا کپ، لہسن ایک چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، کلونجی آدھا چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، ٹماٹر تین عدد (باریک کٹے ہوئے)، پیاز ایک عدد (تلی ہوئی)، ہری مرچ چار عدد

پہلے تیل میں بھنڈیاں فرائی کرلیں، یہاں تک کہ وہ براؤن ہو جائیں۔ پھر انھیں نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔

اب اسی تیل میں لہسن، نمک، پسی لال مرچ، کلونجی اور ہلدی فرائی کریں اور تھوڑا پانی شامل کر دیں۔

پھر اس میں ٹماٹر ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔

آخر میں فرائی کی ہوئی بھنڈیاں، ہری مرچ اور تلی پیاز شامل کر کے دس منٹ کے لیے دم پر چھوڑ دیں۔ بھنڈی مصالحہ تیار ہے۔

اسپائسی دال پالک

اجزا: مونگ دال ایک کپ، مسور دال ایک کپ، پالک ایک گٹھی، ہری مرچ چھ عدد، لال مرچ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، ہلدی ایک چائے کا چمچ، لہسن ادرک پیسٹ دو چائے کے چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، کریم آدھا کپ، ٹماٹر دو سو پچاس گرام

بگھار لگانے کے لیے:

کری پتے دس عدد، زیرہ ایک کھانے کا چمچ، لہسن جوئے دس عدد، تیل آدھا کپ، پیاز ایک عدد

ترکیب: مونگ دال، مسور دال اور پالک کو دھو کر صاف کرلیں۔

ایک پین میں مونگ دال، مسور دال اور پالک کو پانی کے ساتھ ہلکی آنچ پر پکالیں۔ جب پالک اور دونوں دالیں گل جائیں تو اس میں لال مرچ پاؤڈر، ہلدی، لہسن ادرک کا پیسٹ، نمک اور ٹماٹر ڈال کر مکس کرلیں اور دس منٹ تک پکنے دیں۔ پھر ہری مرچ شامل کر دیں اور چولہے سے ہٹا دیں۔ اب اس میں کریم شامل کر دیں۔

بگھار لگانے کے لیے: ایک دوسرے پین میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز کو سنہرا کرلیں۔ پھر اس میں کری پتے، زیرہ اور لہسن جوئے ڈال دیں۔ آخر میں بگھار لگا کر سرو کریں۔

(بحوالہ: www.khanapakana.com)

شکیل احمد

معدنی عناصر اور پانی

جسم کو معدنی عناصر کی بھی قلیل مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو ہم غذا سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ عناصر نمک کی شکل میں یا نباتات سے حاصل غذا میں شامل ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں پانی میں بھی یہ عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ان معدنی عناصر میں ضروری عناصر ہائیڈروجن، آکسیجن، کاربن، نائٹروجن فاسفورس، کیلیشیم، سلفر، کلورین، آیوڈین، سوڈیم، پوٹاسیم، میگنیشیم، لوہا، تانبا، جستہ، مینگنیز، کوبالٹ، ونیڈیم اور فلورین ہیں۔ ان میں ضرورت کے اعتبار سے فاسفورس، کیلیشیم، آیوڈین، سوڈیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، لوہا، تانبا، جستہ، مینگنیز اور فلورین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ہم لاعلمی کی وجہ سے معدنی اشیا کے استعمال کی اہمیت کو نہیں سمجھتے لیکن تحقیقات کے بعد ان اجزا کی افادیت خوب واضح ہوگئی ہے۔ معدنی اشیاء جسم کے اعضا کے بننے اور ان کی نشوونما خصوصاً ہڈی، دانت وغیرہ کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ ہڈی میں کئی معدنی اجزا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہڈی میں سختی اور مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں بہت ضروری اور خاص اشیاء کیلیشیم، میگنیشیم، فاسفیٹ، کاربونیٹ، کلورائڈ، فلورائڈ اور سائٹریٹ ہیں اس کے علاوہ خون کے ہیموگلوبن میں لوہا بھی ہوتا ہے اور پروٹین بننے کی کیمیائی عمل میں میگنیشیم عمل معاون ہوتا ہے جسم میں پائے جانے والے انزائم میں بھی یہ عناصر بحیثیت کو انزائم عمل کرتے ہیں۔

یہ عناصر جیسا کہ آپ کو علم ہوا حیاتین کے مثل ہمارے جسم کے لیے بہت ضروری ہیں لیکن بعض حالتوں مثلاً کچھ بیماریوں میں ان کا استعمال مضر ہوتا ہے۔ دل کے امراض فشار خون (Blood Pressure) وغیرہ میں نمک کا استعمال مضر ہے۔ اسی طرح گردہ کی بیماری (پتھری وغیرہ) میں کیلیشیم کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

معدنی عناصر ترکاریوں اور پھلوں میں افراط سے ملتے ہیں۔ پوٹاسیم، کیلیشیم، سوڈیم، لوہا اور فاسفورس پتوں والی سبزیوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جن لوگوں کی غذا میں پھل، ترکاریاں اور دودھ کی زیادتی رہتی ہے وہ لوگ زیادہ عمر ہونے پر ضعف پیری...... اور انحطاطی امراض (Degenerative diseases) میں مبتلا نہیں ہوتے۔

ترکاریوں میں موجود معدنی عناصر کی مقدار کا صحیح نقشہ پیش کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ مقدار کاشت کی جائے وقوع، وہاں کی مٹی کی خصوصیات اور زرخیزی اور ان میں موجود اجزا کھاد، آب وہوا، دھوپ کی روشنی حاصل کی گئی حدت بارش وغیرہ کئی چیزوں پر منحصر ہے۔ نشیبی زرخیز زمین کی ترکاریوں میں معدنیات کی کمی ہوتی ہے لیکن خشک زمین گو کہ فصل اچھی نہیں ہوتی لیکن وہاں سے حاصل غذاؤں میں معدنیات کی خوب کثرت ہوتی ہے۔ ترکاری کو کتنی نشوونما ہونے پر توڑا گیا اس پر بھی معدنیات کی مقدار منحصر ہے۔ نشیبی زرخیز زمین کی ترکاریوں میں معدنیات کی کمی ہوتی ہے لیکن خشک زمین میں گو کہ فصل اچھی نہیں ہوتی لیکن وہاں سے حاصل غذاؤں میں معدنیات کی خوب کثرت ہوتی ہے۔ ترکاری کو کتنی نشوونما ہونے پر توڑا گیا اس پر بھی معدنیات کی مقدار منحصر ہے۔ بعض ترکاریاں کچی، نازک اور سلی حالت میں اچھی ہوتی ہیں اور بعض مکمل اور

پختہ ہوجانے پر اچھی ہوتی ہیں۔ دن کے کسی وقت سبزی توڑی گئی اس پر بھی اس کی غذائیت منحصر ہے۔ بہتر ہے کہ صبح اول وقت سبزی پیڑ سے توڑی جائے۔

کھانا پکانے میں بھی کبھی ضروری معدنیات ضائع ہوجاتے ہیں اس لیے جس پانی میں ترکاری ابالی یا پکائی جائے اس پانی کو بھی استعمال کر لینا چاہیے کیونکہ تقریباً آدھے معدنیات اس پانی میں حل ہوکر نکل جاتے ہیں۔ ترکاریاں جو روغن میں پکائی جاتی ہیں ان میں معدنیات کم ضائع ہوتے ہیں۔ معدنیات کی جو مقدار کھانے کے ذریعہ قنال ہاضمہ میں پہنچتی ہے اس کا جذب ہوکر جسم میں استعمال ہونا دوسرے معدنیات پر منحصر ہے۔ اس سے سبھی معدنیات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ معدنیات کے جسم میں صحیح استعمال کے لیے نظام ہاضمہ کا درست ہونا ضروری ہے۔ غذا کو خوب چبا کر کھانا نظام ہاضمہ کا درست ہونا اور آنتوں کا صحیح طور پر کام کرنا جسم کو معدنی عناصر کرنے کے لیے ضروری ہے۔

کیلیسم اور فاسفورس

جسم کی ساخت پر چار اہم عناصر کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن کے بعد کیلیسم کا نمبر ہے۔ کیلیسم کا نام نہ صرف جسم کے اہم عظامی نظام کی تعمیر ہے بلکہ جسم میں پائے جانے والے نقصاندہ تیزاب کے اثرات کو بھی ختم کرتا ہے۔ فوات خلیہ کے جز کی حیثیت سے کیلیسم بہت ضروری کام انجام دیتا ہے اور نشوونما کے دوران جسم میں ہڈی کی ساخت صحیح طریقہ سے ہوسکے اسی غرض سے کیلیسم کی ضروری مقدار کی غذا میں شمولیت

اہمیت رکھتی ہے اوائل عمری میں جسم میں کیلیسم کافی مقدار میں جمع ہوجانے سے جوانی اور بڑھاپے میں صحت عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہڈی کی ساخت ایک بار ہوجانے کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے بلکہ بڑی عمر میں بھی عظامی منسوجات کی تعمیر اور تجدید کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ انسان کو روزانہ ایک گرام سے دو گرام تک کیلیسم کی ضرورت پڑتی ہے۔ صحیح مقدار طے کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ خوراک میں موجود دوسرے اجزا خصوصاً فاسفورس پر منحصر ہے۔ جسم میں تیزاب بنانے والی اشیا (گوشت، پنیر، انڈا، میدا سے بنی چیزیں۔ صاف کی ہوئی شکر اور چربی) کا استعمال کم کرنے سے جسم کو کیلیسم کی کم ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر مناسب خوراک میں ضرورت کے موافق کیلیسم ہمیں مل جاتا ہے۔ بچوں، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو خوراک میں نسبتاً زیادہ کیلیسم لینا چاہیے۔

غذا میں کیلیسم اور فاسفورس کا خاص تناسب ہونا چاہیے۔ عموماً مکمل معدنیات، قوت دفاع اور ہڈیوں کی استبداد کے لیے کیلیسم اور فاسفورس کا تناسب تقریباً 1.7:1.0 ہونا چاہیے۔ یہ تناسب گری دار میووں اور گودے دار پھلوں میں پایا جاتا ہے۔ اناج میں یہ تناسب بالکل مختلف ہوتا ہے اور ان میں فاسفورس نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے

بغیر چھنے آٹے کی روٹی	1:4::Ca : P
جوار کی بھوسی	1:4.6
آٹے کے سیو (مکرونی)	1:7
زرد مٹر	1:7

گوشت میں یہ تناسب کچھ اس طرح ہوتا ہے۔ مچھلی میں تناسب کم ہوتا ہے۔

گوشت	1:27 : : Ca : P

اناج میں اس تناسب کے فرق کو کم کرنے کے لیے ان غذاؤں کا استعمال کرنا چاہیے جن میں یہ تناسب کم ہے۔ جیسے

نارنگی	1:0.5 Ca : P لیمو	1:0.7:: Ca: P
سلاد کا ہو	1:0.6 مولی	1:0.7
گائے کا دودھ	1:1.0 پنیر	1:1.4
خشک انجیر	1:1.17 پھول گوبھی	1:1.0
اجمود	1:1.0 گاجر	1:1.1

ترکاریاں۔ جڑی بوٹیاں پھل اور دودھ اس اعتبار سے روٹی کا تکملہ ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ نارنگی کے رس میں موجود سٹرک ایسڈ آنتوں میں موجود دوسری غذاؤں کے کیلیسم کو کیلیسم اسٹریٹ میں تبدیل کر دیتا ہے جو

آسانی سے جذب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وٹامن ڈی ان کیلسیم سالٹ کو ہضم ہونے میں مدد دیتے ہیں جو دیر میں ہضم ہوتے ہیں۔

برخلاف اس کے غذا میں کچھ چیزوں کی موجودگی سے کیلسیم کے استعمال میں دشواری ہوتی ہے جیسے فائٹک ایسڈ (فائٹن) اور آکسیلک ایسڈ۔ یہ کیلسیم سے مل کر غیر محلول کیلسیم سالٹ بناتے ہیں جو آسانی سے جسم میں اور خون میں جذب نہیں ہو پاتے۔ فائٹن اناج (مثلاً گیہوں اور جو) کی اوپری سطح میں ہوتا ہے اور آکسیلک ایسڈ ریوند چینی پالک اور بتھوا وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ فائٹک ایسڈ یا تو آٹا گوندھتے وقت خمیر کے اثر سے ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر آنتوں میں بی قولائی جراثیم کے اثرات سے ضائع ہو جاتا ہے۔

1۔ کیلسیم کی کثرت والی غذائیں: پنیر اور تل ہیں۔ ان میں سو گرام میں آدھ گرام سے ڈیڑھ گرام تک کیلسیم ہوتا ہے۔

2۔ زیادہ کیلسیم والی غذائیں: بادام، کالی مولی، گانٹھ گوبھی کے پتے، خشک انجیر اور کھیرا ہیں۔ ان میں سو گرام میں $\frac{1}{5}$ گرام سے ½ گرام تک کیلسیم ہوتا ہے۔

3۔ نسبتاً زیادہ کیلسیم والی غذائیں: مونگ پھلی، اخروٹ، انڈے کی زردی، پکی پھلیاں (سیم وغیرہ)، لیمو، دودھ۔ سنترہ، گندنا، کرم کلہ، سلاد کاہو، پھول گوبھی، چقندر، کاسنی، اجمود ہیں ان میں سو گرام میں $\frac{1}{10}$ گرام سے $\frac{1}{5}$ گرام تک کیلسیم ہوتا ہے۔

ہڈی اور دانتوں کے بننے کے لیے فاسفورس اور کیلسیم سب سے اہم اور بنیادی چیزیں ہیں۔ ہڈی کا تقریباً 80 فیصدی حصہ انھیں سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ مردوں کو کم از کم 0.9 گرام، بچوں اور نوجوانوں کو 1.3 گرام اور حاملہ اور دودھ پلاتی عورتوں کو 1.5 گرام فاسفورس روزانہ چاہیے۔ فاسفورس اور کیلسیم کے تناسب کی اہمیت کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

زیادہ فاسفورس والی غذائیں (جن میں کیلسیم کا تناسب بھی ٹھیک ہے۔

1۔ ہر طرح کا پنیر۔ اس میں 100 گرام میں 2.3 گرام P_2O_5 ہوتا ہے۔

2۔ مونگ پھلی، بادام، اخروٹ، فندق پکی پھلیاں (سیم وغیرہ) پکی مٹر، مسور: ان میں 100 گرام میں 0.5 گرام سے 1.1 گرام تک فاسفورس ہوتا ہے۔

3۔ انڈا (مرغی کا چھلکا نکال کر) مٹھ گانٹھ گوبھی، کرم کلہ، زمین قند، کشمش، خشک انجیر، دودھ: ان میں 100 گرام میں 0.2 گرام سے 0.5 گرام تک فاسفورس ہوتا ہے۔

4۔ انگور، برگ اجمود، پھول گوبھی، آلو، خرول، اجمود، سلاد کاہو، کھجور، کیلے، نارنگی: ان میں 100 گرام میں 0.1 گرام سے 0.2 گرام تک فاسفورس ہوتا ہے۔

میگنیشیم

ہڈی اور دانتوں کے بننے میں میگنیشیم کی بھی بہت اہمیت ہے۔ لیکن کیلسیم کے مقابلہ اس کی کم مقدار کی ضرورت ہے۔ جسم میں موجود کل میگنیشیم کا تقریباً 70 فیصدی ہڈیوں میں پایا جاتا ہے۔ روزانہ تقریباً 0.3 گرام میگنیشیم کی ضرورت انسان کو ہے آنتوں میں غذا سے میگنیشیم کے جذب ہونے کا انداز بالکل کیلسیم کی طرح ہے روزانہ کی خوراک میں عام طور پر ضرورت بھر میگنیشیم حاصل ہو جاتا ہے تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ معقول مقدار میں میگنیشیم تندرستی پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ میگنیشیم رکھنے والی خاص غذائیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ بادام، مونگ پھلی، فندق، پکی پھلیاں (سیم، لوبیا وغیرہ) کالی مولی، جئی چینا (باجرہ۔ کودوں وغیرہ)، جوار، میٹھا دانہ، رائی، گیہوں، جو، کھیرا، نسرین: ان میں 100 گرام میں تقریباً 0.1 گرام سے 0.2 گرام تک میگنیشیم ہوتا ہے۔

2۔ اخروٹ، پیاز، ٹماٹر، کھجور، انجیر، کشمش، پنیر: ان میں 100 گرام میں تقریباً 0.05 گرام سے 0.1 گرام تک میگنیشیم ہوتا ہے۔

لوہا

حیاتیاتی عناصر میں لوہا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ سرخ جسیمۂ

دموی (Red blood) کے ہیموگلوبن، عضلات کی پروٹین (مایوگلوبن) مختلف انزائم خون کے پلازما اور جسم کے خلیوں کا اہم جز ہے۔ ہیموگلوبن سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں لی گئی ہوا کی آکسیجن جذب کرتا ہے۔لوہے کی کمی سے ہیموگلوبن کی کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ضروری آکسیجن جو ہماری غذا کا تکسیری عمل کر کے توانائی دیتی ہے کم حاصل ہوتی ہے۔آکسیجن کو جسم کے مختلف اعضا میں پہنچانے اور مضر گیس کاربن ڈائی آکسائڈ کو خارج کرنے میں خون مدد کرتا ہے۔لوہے کی کمی سے فقر الدم کی بیماری جو عموماً عورتوں میں پائی جاتی ہے پیدا ہو جاتی ہے۔ انیمیا میں آدمی جلد تھک جاتا ہے۔اگر انیمیا بڑھ جائے تو آدمی میں سوچنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے اور وہ باتوں کو بھول جاتا ہے۔انیمیا کی کمی لوہے کے علاوہ جسم میں دوسرے اجزا کی کمی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ بیماری چونکہ عام طور پر لوہے کی کمی سے ہوتی ہے اس کے لیے زیادہ لوہا رکھنے والی غذا کا استعمال کرنا چاہیے۔

ایک جوان آدمی کو 12 ملی گرام روزانہ لوہے کی ضرورت ہوتی ہے اور بچوں کو 12 ملی گرام سے 15 ملی گرام کی۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو 15 ملی گرام لوہا روزانہ چاہیے۔ اچھی صحت کے لیے لوہے کی روزانہ کی مقدار اس سے زیادہ ہی ہونا چاہیے۔جسم لوہے کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔خون کے لال ذرات جب جگر میں ٹوٹتے ہیں تو جگر ان پرانے ٹوٹے ہوئے ذرات کے لوہے کو محفوظ کر لیتا ہے اور اس سے نئے خون کے لال ذرات بنتے ہیں۔یہ نئے ذرات مغز عظم (MarrowofBones) میں بنتے ہیں۔بعض حالتوں میں جسم سے خارج بھی ہوتا ہے جیسے:

خون کے بہنے عورتوں اور لڑکیوں کے ایام حیض اور حمل میں۔اس لیے لوہے کا خاص کر زیادہ استعمال اوائل عمری کو سن بلوغ میں، حاملہ عورتوں یا ان لوگوں کو جن کا خون ضائع ہو گیا ہو یا بخار میں ضروری ہے 13 سال سے 18 سال کی عمر کی لڑکیوں میں خصوصاً لوہے کی کمی ان کی نشوونما اور حیض جاری ہونے کی وجہ سے ہو جاتی ہے لوہے کی اس کمی کو مناسب غذا کے استعمال سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ آج کل نا مناسب عادات غذا کے نتیجہ کے طور پر عموماً لڑکیوں میں انیمیا کا اثر لوہے کی کمی کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔اس کا مستقل اثر ان کی آئندہ کی زندگی پر پڑتا ہے۔ اس خرابی کو صحیح غذا کے استعمال سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر جسم میں خون کی زیادہ کمی ہو جائے جیسے مہلک انیمیا میں تو کلیجی کا عرق یا دوائیں جن میں لوہے کے اجزا شامل ہوں دینا چاہیے۔غذا میں ضرورت سے زائد لوہے کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ زائد لوہا آسانی سے جسم سے باہر نکل جاتا ہے۔

لوہا حاصل کرنے کی بہترین غذائیں پھل، ترکاریاں، ثابت اناج، جانوروں کی کلیجی، گردے، گوشت، انڈے کی زردی، مٹر، بادام، کشمش، آلو، کرم کلا، گڑ، گری دار میوے، خوبانی، ہری سبزیاں، گیہوں کا چھلکا، آٹا اور روٹی ہیں۔ ایک بات جان لینا ضروری ہے کہ اکثر غذا میں لوہے کی مقدار کافی ہونے کے باوجود اس کا کم حصہ آنتوں میں ہضم ہو کر جذب ہوتا ہے۔اس کے برخلاف بعض پھلوں اور میووں میں لوہے کی کمی کے باوجود اس سے اچھی مقدار میں لوہا جسم میں ہضم اور جذب ہوتا ہے مثلاً آم، امرود، کھجور، انجیر، لیموں، آڑو اور شفتالو وغیرہ۔ سیب، ناشپاتی، کیلا، انار ،منقہ، کشمش، چیر نیر، انگور، خوبانی، بیر اور آلو بخارا وغیرہ سے خون میں ہیموگلوبن بنتا ہے۔اس کی وجہ صرف ان میں لوہے کی موجودگی ہی نہیں بلکہ ایسے اجزا کی موجودگی بھی ہے جو غذا میں سے لوہے کو جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔مثلاً پالک میں سیپونین اس طرح کا کام کرتا ہے۔ دودھ میں خود اگرچہ لوہے کی کمی ہوتی ہے لیکن اس کو پینے کے بعد دوسری غذاؤں سے حاصل لوہا آسانی سے جسم میں استعمال ہو جاتا ہے۔ضروری نہیں کہ غذا میں موجود لوہا جسم میں استعمال ہی ہو جائے کیلشیم کی طرح لوہے سے مل کر بھی فائٹک ایسڈ اور آکسیلک ایسڈ غیر محلول مرکب بناتے ہیں جن کا جسم میں استعمال نہیں ہو پاتا۔ پالک میں موجود لوہا غیر محلول ہوتا ہے۔ گوشت اور کلیجی کا لوہا بھی آسانی سے جذب نہیں ہو پاتا۔

زیادہ لوہے کی غذائیں

1۔اجموہ(Colory): اس میں سو گرام میں 500 ملی گرام لوہا ہوتا ہے۔

2۔پنیر کریم: اس میں سو گرام میں 66 ملی گرام لوہا ہوتا ہے۔

3۔سنترہ: اس میں سو گرام میں 75 ملی گرام لوہا ہوتا ہے۔

4۔پالک (تازی اور اچھی کھاد میں پیدا ہوئی)، شہد، شلجم، ثابت چاول، مونگ پھلی، فندق، کالی مولی، خشک ہری رائی، گندنا، سلاد کا ہو، جوار کی بھوسی، یروشلم ہائی چوک، گانٹھ گوبھی، مسور، ریشہ خرول، کاسنی، زمین قند اور رائی وغیرہ میں لوہا ہوتا ہے۔

سوڈیم، پوٹاسیم اور پانی

جسم کے سیالی مادہ میں سوڈیم، پوٹاسیم اور پانی ہوتے ہیں۔ پوٹاسیم کے مرکبات (پوٹاسیم فاسفیٹ اور پوٹاسیم بائکاربونیٹ) جسم کے خلیوں اور خون کے ذرات کے اندرونی حصہ میں اور سوڈیم کے مرکبات (سوڈیم کلورائیڈ اور سوڈیم بائیکاربونیٹ) خون اور نسیجوں کے رقیق اور خلیوں کے گردوالے ماء میں پائے جاتے ہیں۔ خلیوں کے اندرونی اور بیرونی رقیق ہم طنابی ہوتے ہیں اور جتنا ہی زیادہ پوٹاسیم خلیوں کے اندر اور سوڈیم خلیوں کے باہر ہوگا اتنا ہی ان میں تناؤ زیادہ ہوگا۔ نتیجہ کے طور پر اعضا میں زیادہ کام کرنے کی طاقت اور جوش ہوگا اور جسم اتنا ہی صحت مند ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر یہ بات نہیں ہے تو کام کرنے کے جوش میں کمی خلیوں میں سانس لینے کی کمی، قوت دفاع کی کمی اور نئی نشوونما میں کمی واقع ہوگی یہ دیکھا گیا ہے کہ صرف تازی اور کچی نباتات ہی اس خوبی کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ نمک کا کلورین پیٹ کے گیسٹرک رس میں نمک کا تیزاب بناتا ہے جو پروٹین کے ہاضمہ میں مدد دیتا ہے۔

جسم میں تقریباً 70 فیصدی پانی ہوتا ہے جس میں 5 فیصدی سیال خون، 50 فیصدی خلیوں کے اندرونی اور 15 فیصدی ہی خلیوں کے بیرونی رقیق میں ہوتا ہے۔ خلیوں کا باہری سیال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سیال سے خلیات اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور دوسری چیزیں اپنے اندر سے اسی سیال میں نکالتے ہیں۔ یہ ان خلیوں کا درجہ حرارت بھی برقرار رکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے انسان کے جسم کے اندرون پر باہری ماحول کے تغیرات کا بہت کم اثر پڑتا ہے یہ سیال جسم کے باہری موسم، ماحول، حرارت، حالات کے اثر کو کم کرتا ہے جس کی وجہ سے اندرون جسم ان سے محفوظ رہتا ہے۔

جب تک جسم تندرست ہے اس کے اندر کے رقیق کی ساخت اور ترکیب یکساں برقرار رہتی ہے۔ اگر ہم نمک والی غذائیں زیادہ کھائیں یا کھانے میں زیادہ نمک استعمال کریں تو نمک کی مقدار جسم میں بڑھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پانی کی مقدار بھی اسی حساب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے جس کی وجہ سے دونوں کا تناسب برقرار رہتا ہے۔ پانی جب جسم سے زیادہ نکل جاتا ہے جیسے دست یا پسینہ وغیرہ میں تو اسی حساب سے جسم میں نمک کی بھی کمی ہو جاتی ہے۔ جب کبھی ہم بغیر نمک والی غذا کا استعمال شروع کر دیتے ہیں یا نمک کے استعمال میں کمی کر دی جاتی ہے تو اسی حساب سے جسم میں پانی خود بخود کم ہو جاتا ہے۔

جسم میں پانی کم کرنے کے لیے کبھی کبھی نمک کے استعمال میں کمی کر دی جاتی ہے اور ایسی غذائیں استعمال کرتے ہیں جن میں سوڈیم کم سے کم اور پوٹاسیم زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس مقصد کے لیے بغیر نمک کی تازی اور کچی سبزیاں بہت مناسب ہیں۔

دودھ میں سوڈیم اور پوٹاسیم کا تناسب				Na : K : : 4:1
آلو	//	//	//	40:1
چاول	//	//	//	100:1
کیلا	//	//	//	400:1

دودھ پوٹاسیم کی زیادتی کے باوجود پانی کم نہیں کرتا تاوقتیکہ اس میں موجود نمک خاص طریقوں سے نکال نہ دیا جائے۔ مندرجہ ذیل فہرست سوڈیم اور پوٹاسیم کے تناسب کو مختلف غذاؤں میں ظاہر کرتی ہے۔

سوگرام۔پوٹاسیم۔سوڈیم سوگرام۔پوٹاسیم۔سوڈیم Na:K

تازی شے	ملی گرام		ملی گرام
کیلا	400	1	1:400
بروسلز کونپل	380	4	1:93
شاہ دانہ (ولایتی مکو)	280	1	1:280
ترشک	360	4	1:90
سنترہ	460	2	1:230
گانٹھ گوبھی	260	5	1:52
گیہوں	430	2	1:215
پختہ مٹر	820	17	1:48
ناشپاتی	180	1	1:180
فندق	620	13	1:48
جوار	340	2	1:170
گاجر	390	9	1:43
لیمو	460	3	1:153

آلو	460	130	1:40
بند گوبھی	560	4	1:140
بادام	840	23	1:37
کالامنقہ	260	2	1:130
شاخ گوبھی	400	24	1:25
نارنگی	250	2	1:125
آلوچہ	220	10	1:22
لال منقہ	110	1	1:110
لوبیا	220	10	1:22
چاول	100	1	1:100
خشک انجیر	970	46	1:21

مندرجہ بالا فہرست کی مدد سے ہم مکمل خوراک جس میں پوٹاسیم زیادہ اور سوڈیم کم ہو تیار کر سکتے ہیں۔ نسیموں میں موجود پانی کو کم کرنے کے لیے جو فربہی (موٹاپے) کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے، ہم ایسی غذاؤں کا استعمال کرتے ہیں۔

لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ نارنگی اور لیمو سے تیزاب بنتا ہے بلکہ اس میں کھاری چیزیں زیادہ ہوتی ہیں جس سے کھار بنتا ہے۔ لیمو میں نامیاتی تیزاب سٹرک ایسڈ ہوتا ہے۔ یہ جسم میں جل کر توانائی دیتا ہے لیکن لیمو میں باقی رہے معدنی اجزا کھار بناتے ہیں۔

نمک کی کمی سے عضلات میں تشنج (اینٹھن) پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہم لوگ غذا اور الگ سے نمک کافی مقدار میں لیتے ہیں اس لیے اس مرض کی نوبت کم آنے پاتی ہے۔ جسم سے نمک پیشاب اور پسینہ کے ذریعہ زیادہ حصہ خارج ہوتا ہے۔ اس لیے گرمیوں میں اور زیادہ محنت کرنے کے بعد مزید نمک کی ضرورت ہوتی ہے۔ گرم جگہوں پر کام کرنے والے مثلاً کوئلہ جھونکنے والے، لوہے کا کام کرنے والے اور کانوں میں کام کرنے والے لوگ اور گرم ممالک کے باشندوں کو نمک کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے پسینہ میں نمک بہت نکل جاتا ہے۔

قلیل عناصر (Trace Elemented)

آیوڈین (Iodine)

تھوڑی مقدار میں آیوڈین انسان کے لیے ضروری ہے آدمی کو تقریباً 0.15 ملی گرام آیوڈین روزانہ چاہیے۔ ایک آدمی کے جسم میں جس کا وزن 70 کلوگرام ہے تقریباً 50 ملی گرام آیوڈین ہوتی ہے جس کا پیشتر حصہ تقریباً 40 ملی گرام گلے کے غدود رقیہ (Thyroid Glends) میں جمع ہو کر تھائی روکسن نام کا ایک درقیہ ہارمون (Thyroid-hormone) بناتا ہے۔ جسم میں آیوڈین کی کمی سے تھائرائڈ ہارمون میں کمی آ جاتی ہے جس کی وجہ سے کنٹھ مالا اور گھینگے کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں ماں کے جسم میں آیوڈین کی کمی کے نتیجہ میں بچے ذہنی طور پر کمزور اور بدہیئت پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ان کو ابتدا میں پیدائش کے فوراً بعد مناسب مقدار میں آیوڈن فراہم کی جائے تو وہ معمول پر آ سکتے ہیں۔ اس غرض سے کھانے کے نمک میں سوڈیم آیوڈائڈ ملا کر بچوں کو دیتے ہیں۔

پینے اور کھانے کے استعمال میں آنے والے پانی میں عموماً آیوڈین جسم کی ضرورت کے لیے کافی ہوتی ہے۔ سمندروں میں چونکہ پانی میں آیوڈین بہت موجود رہتی ہے اس لیے وہاں سے حاصل غذائیں مثلاً سمندری مچھلیاں، صدوف، سلاد آبی، جر جیر وغیرہ میں کافی آیوڈین ہوتی ہے۔ سمندر کے کنارے دور تک زمین میں سمندر کے پانی کا اثر ہوتا ہے اس لیے وہاں کی ترکاریوں اور پانی میں آیوڈین بہت ہوتی ہے۔ لیکن جو علاقے سمندر سے دور ہیں خصوصاً پہاڑی علاقے وہاں کی زمین اور پانی میں آیوڈین کی کمی ہوتی ہے اس لیے وہاں گھینگے اور کنٹھ مالا کے امراض عموماً پائے جاتے ہیں۔ آیوڈین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے وہاں کے لوگوں کو نمک میں الگ سے آیوڈین شامل کر کے (Iodised salt) استعمال کرنا چاہیے۔

خاص غذائیں جن میں آیوڈین زیادہ ہوتی ہے۔ انڈے، ثابت اناج، رائی، گیہوں اور سلاد کا ہو ہیں۔ بغیر صاف کیے ہوئے نمک میں بھی آیوڈین ہوتا ہے جو صاف کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔

کیروٹین (وٹامن اے) سے بھی آیوڈین کی کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر سن بلوغ۔ دوران حمل، دوران رضاعت اور امراض متعدی میں

جسم کو زیادہ آیوڈین کی ضرورت ہوتی ہے۔

کلورین (Chlorine)

یہ عموماً کھانے کے نمک (Nacl) سے جسم کو حاصل ہوتا ہے۔ خون میں موجود نمک سے معدہ میں نمک کا تیزاب (Vcl) بنتا ہے۔ غذا میں کلورائڈ کی کمی سے بھوک کم لگتی ہے، پانی کی خواہش زیادہ ہوتی ہے گرمی زیادہ لگتی ہے اور جسم میں نائٹروجن اور توانائی کی کمی ہو جاتی ہے۔

فلورین (Flourine)

یہ ہڈیوں اور دانتوں کا ایک جز ہے مچھلی اور چاء کے علاوہ دوسری غذاؤں میں یہ بہت کم پائی جاتی ہے پانی میں کچھ نہ کچھ فلورین ضرور ہوتی ہے لیکن اس کی مقدار ہمیشہ یکسا نہیں رہتی۔ جب پینے کے پانی میں فلورین کی کمی ہوتی ہے تو دانت کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً بچوں میں اس کا اثر بہت ہوتا ہے۔ اگر پینے کے پانی میں دس لاکھ حصے میں ایک حصہ سوڈیم فلورائڈ کی آمیزش کر دی جائے تو بچوں کے دانت اس حالت سے دو چار نہیں ہو سکتے۔ غذا میں فلورین کے کثرت استعمال سے دانتوں کے اوپر سفید رنگ کی تہہ جم جاتی ہے۔

تانبا (Copper)

تانبا خون میں ہیموگلوبن بننے اور کچھ انزائم بننے میں مدد دیتا ہے انسان کو روزانہ تقریباً دو ملی گرام تانبے کی ضرورت ہے۔

تانبا رکھنے والی اہم غذائیں: انڈے کی زردی میں 22 ملی گرام فیصد گرام اور رائی (مکمل دانہ) میں 4 ملی گرام سے 30 ملی گرام فیصد گرام تانبا ہوتا ہے۔

نسبتاً زیادہ تانبے والی غذائیں: بادام، اخروٹ، لال مولی، مٹر میں 1.0 ملی گرام سے 1.2 ملی گرام فیصد گرام تک تانبا ہوتا ہے۔

مسور۔ خشک انجیر اور کھجور میں 0.4 ملی گرام سے 0.7 ملی گرام فیصد گرام تک تانبا ہوتا ہے۔ کیلا، کالی بیری، خوبانی، منقہ، آلوچہ، کشمش، شاہ دانہ، آلو، پھول گوبھی، گانٹھ گوبھی، مولی، ناگدون (ایسپریکس) پالک وغیرہ میں 0.1 ملی گرام سے 0.2 ملی گرام فیصد گرام تک تانبا ہوتا ہے۔

کوبالٹ

وٹامن بی 12 میں کوبالٹ کی موجودگی اس عنصر کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ ٹماٹر میں کوبالٹ خوب ہوتا ہے۔

مینگنیز:

یہ اہم عنصر جسم میں بہت سے انزائم بننے میں مدد دیتا ہے۔ روزانہ 2 ملی گرام سے 3 ملی گرام تک مینگنیز کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے۔ یہ نباتات سے حاصل غذاؤں میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ جوز، جوار، رائی، گیہوں، شیریں اناج پھلیاں (سیم، لوبیا۔ باقلا وغیرہ) میں یہ 2 ملی گرام سے 5 ملی گرام فیصد گرام تک ہوتا ہے۔ لونگ میں مینگنیز بہت ہوتا ہے جو اس کے گہرے نیلے رنگ کی راکھ سے ظاہر ہوتا ہے۔

جست (Zinc)

جست جو کہ انزائم کا جز ہے۔ انسان کو روزانہ 5 ملی گرام سے 20 ملی گرام تک درکار ہوتا ہے۔ جسم میں اس کی کمی سے نشو ونما اور تحول پر اثر پڑتا ہے۔ جست غذا کے ذریعہ عموماً جسمانی ضرورت کے مطابق حاصل ہو جاتا ہے اس کے لیے اس کی کمی کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔

مولبڈنم

جسم کو بہت تھوڑی مقدار مولبڈنم کی چاہیے۔ اس کی ضرورت تین انزائم Ceathine Oxidase, aldehyde, oxidase, nitrate red کے لیے ہوتی ہے۔

(ہماری غذا، شکیل احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، تیسری طباعت 2010)

حسن کی نگہداشت

چمکتا ہوا چہرہ پانے کے چھ بیوٹی ٹپس

اپنے چہرے پر گلو چاہتے ہیں تو ان چھ بیوٹی ٹپس کو آپ روزانہ آزمائیں، آپ کا چہرہ بے داغ اور پرکشش نظر آئے گا۔

1۔ جلد کی صفائی کے لیے کبھی کبھی کچا پیاز کھانا چہرے کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ اس سے چہرے کے داغ دھبوں کے کم ہونے میں بھی مدد ملتی ہے۔

2۔ فریش دکھنے کے لیے آنکھوں کو آرام دینا بھی بیحد ضروری ہے۔ زیادہ دیر تک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنے والوں کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے باہر دیکھنا چاہیے آنکھوں کی ہلکی پھلکی ایکسرسائز کرنا چاہیے، اس سے آنکھوں کو آرام ملتا ہے۔

3۔ چہرے پر ماسک لگانے سے چہرے کی جلد پر موجود مردہ خلیات ہٹ جاتی ہیں۔ اس سے چہرہ خوبصورت ہوتا ہے اور جلد ٹائٹ ہوتی ہے اور جھریاں بھی کم ہوجاتی ہیں۔

4۔ نہانے سے بھی چہرے پر رونق آتی ہے۔ حالانکہ 10 منٹ سے زیادہ دیر تک نہیں نہانا چاہیے۔ زیادہ دیر تک نہانے سے بھی جلد کی نمی کم ہوجاتی ہے۔ گرم پانی سے دیر تک نہانے سے جلد پر لال دھبے بھی پڑ سکتے ہیں۔

5۔ دوپہر کے وقت تقریباً سبھی کو نیند آنے لگتی ہے۔ کام کے بیچ کے وقت میں سے 5 منٹ نکال کر بھی آنکھیں بند کریں، تو یہ فائدے مند ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف توجہ مرکوز کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ خون میں سیروٹونن ہارمون کی سطح بڑھتی ہے۔ یہ ہارمون خوشی کے احساس کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔

6۔ دن بھر کی تھکان اتارنے میں تازہ ہوا مدد کرتی ہے۔ تھوڑی دیر چلنا یا ہلکی پھلکی ایکسرسائز سے بھی چہرے پر رونق آتی ہے۔ برٹین کی ایسکس یونیورسٹی کے مطابق اس سے انسان ہلکا پن بھی محسوس کرتا ہے۔ نیلے آسمان اور ہریالی کے بیچ دماغ میں تازگی آتی ہے۔

بنا میک اپ کے قدرتی خوبصورت دکھنا چاہتی ہیں؟ تو یہ ٹپس آزمائیں

میک اپ سے چہرے کو بے حد خوبصورت اور جواں دکھایا جا سکتا ہے، لیکن اصل خوبصورتی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ جب آپ کی جلد قدرتی طور پر خوبصورت دکھے گی، تب آپ کو کسی میک اپ کا محتاج نہیں رہنا پڑے گا۔ آیئے، جانتے ہیں بنا میک اپ کے قدرتی خوبصورت دکھنے کے ٹپس:

1۔ چہرہ دھوئیں: رات کو سونے سے پہلے چہرہ ضرور دھوئیں۔ اگر میک اپ لگا ہے تو پہلے ایک اچھے میک اپ ریموور سے اسے ہٹائیں، اس کے بعد گنگنے پانی سے چہرہ دھولیں۔ اگر کہیں باہر گھوم کر آئی ہیں، تو بھی گھر آتے ہی چہرے کو پانی سے دھوئیں۔ صابن کے استعمال سے بچیں۔ گلاب جل سے چہرہ دھونا جلد کے لیے مفید ہے۔

2۔ چہرہ دھوتے ہی کریم لگائیں: چہرہ دھونے کے بعد اسے نمی کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کریم لگانا نا بھولیں۔ کریم کو پورے ہاتھ سے نہیں، بلکہ صرف انگلیوں کے پوروں سے ہی لگائیں اور چہرے پر گول گول ملیں۔ اس سے چہرے کی مالش ہوگی اور خون کا دباؤ بھی تیز ہو جائے گا۔ اگر آپ کی جلد چکنی ہے تو کریم کی جگہ سیرم استعمال کریں۔ گیلے چہرے پر کریم زیادہ اثر کرتی ہے۔

3۔ ہاتھوں کو بار بار چہرے پر نہ لگائیں: بہت لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کچھ سوچتے وقت اپنا چہرہ ہاتھوں کے بیچ میں رکھ لیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے بچیں کیونکہ ہاتھ میں موجود گندگی اور جراثیم چہرے پر لگ سکتے ہیں۔ اگر مہاسے ہیں تو انھیں بھی نا چھوئیں۔ اس سے جراثیم جلد کے اور اندر چلا جاتا ہے اور مہاسے جانے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔

4۔ اسکرب کریں: ہفتے میں ایک بار چہرے کو اسکرب ضرور کریں۔ بازار میں الگ الگ اسکن کے لیے کئی طرح کے اسکرب موجود ہیں۔ کوشش کریں کہ آرگینک اسکرب خریدیں۔ گھر پر جو کے آٹے سے بھی اسکرب بنایا جا سکتا ہے۔ یا پھر سنترے کے چھلکوں کو دھوپ میں سکھا کر ان کا پاؤڈر بنا لیں اور اس سے منہ دھوئیں۔ یہ چہرے سے گندگی اور مردہ خلیات کو ہٹا دیتا ہے، جس سے جلد صاف اور نکھری نظر آتی ہے۔

5۔ ابٹن لگائیں: ہفتے میں دو بار چہرے پر ابٹن لگائیں۔ کھانے پینے کی لگ بھگ ہر متناسب چیز چہرے کی رنگت نکھارتی ہے، مثلاً دہی، دودھ، شہد، ہلدی، بیسن، کھیرا، اسٹرابیری، انڈا، بادام کا تیل وغیرہ۔ ابٹن سے چہرے کی تھکاوٹ بھی دور ہوتی ہے اور چہرے پر چمک آتی ہے۔ ابٹن کے پوری طرح سوکھنے سے پہلے ہی اسے اتار لیں، نہیں تو جھریاں پڑ سکتی ہیں۔

6۔ بھاپ لیں: ابٹن لگانے سے پہلے بھاپ لینے سے چہرے کے جو سوراخ ہوتے ہیں وہ کھل جاتے ہیں اور ابٹن کا اثر گہرائی تک ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس سے چکنائی بھی پگھلتی ہے۔ بھاپ لینے کے بعد چہرے پر ابٹن ضرور لگائیں، نہیں تو جلد میں گندگی جانے کے امکانات بڑھ جائیں گے اور اثر الٹا پڑ جائے گا۔ ابٹن اتارنے کے بعد سوراخ کو بند کرنے کے لیے چہرے پر برف بھی لگا سکتی ہیں۔

7۔ دھوپ سے بچیں: دھوپ جلد کے لیے ضروری ہے لیکن تھوڑی ہی مقدار میں۔ زیادہ دیر دھوپ میں رہنے سے جلد جھلس سکتی ہے۔ بہت تیز دھوپ نا بھی ہو تب بھی سن اسکرین کا استعمال کریں۔ اچھے سے اچھا سن اسکرین بھی دو سے چار گھنٹے ہی اثر دکھا پاتا ہے، اس سے زیادہ وقت دھوپ میں نا گزاریں۔

8۔ کھانے پر دھیان دیں: پیزا اور برگر آپ کی خوبصورتی کو کم کر سکتے ہیں۔ ان میں بہت زیادہ چکنائی اور نمک ہوتا ہے۔ بھوک لگنے پر تازہ پھل اور میوے کھائیں۔ تربوز جھریوں پر اثر دار ہے اور جلد کے کینسر سے بھی بچاتا ہے۔ اخروٹ بھی جلد کے لیے بہت مفید ہے۔ اس میں موجود تیل اور فیٹی ایسڈ جلد کی مرمت کرتا ہے۔

9۔ خوب پانی پیجیے: صرف پیاس بجھانے کے لیے ہی نہیں، خوبصورت دکھنے کے لیے بھی خوب پانی پینا چاہیے۔ جسم کے وزن کے کے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

اگر آپ کی جلد خشک ہے، تو یہ فیس پیک آپ کے لیے رہیں گے بہتر

چہرے کو صاف، خوبصورت اور دمکتا بنانے کے لیے کئی طرح کے فیس پیک ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ آپ کی جلد کے لیے کون سے فیس پیک کا انتخاب بہتر ہوگا۔ سبھی کی جلد کی اقسام الگ الگ ہوتی ہیں۔ کسی کی روغنی، کسی کی نارمل تو کسی کی خشک جلد ہوتی ہے۔ اگر آپ کی اسکن خشک ہو تو نیچے بتائے گئے فیس پیک کا استعمال آپ کو ضرور کرنا چاہیے۔

1۔ خشک جلد کو نمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے آدھا کپ کیلا اور پپیتا، کم مقدار میں تربوز اور گاجر، گلاب جل، گلیسرین اور آدھا چمچ ملائی کو ایک ساتھ پیس لیں۔ اب چہرے کو دھو کر بھاپ لیں اور پھلوں سے بنائے گئے اس پیک کو چہرے پر لگا کر کچھ دیر تک مساج کریں۔ اس کے بعد گنگنے پانی سے چہرہ دھولیں۔

2۔ باقاعدگی سے جلد کی دیکھ بھال کے لیے کیلے کو میش کر کے اس میں شہد ملا کر چہرے پر لگایا جاسکتا ہے۔ اسے 20 منٹ تک چہرے پر لگا کر دھولیں۔ اس سے جلد میں قدرتی نمی بنی رہے گی اور نختی کے ساتھ ساتھ چمک بھی آئے گی۔

3۔ انڈے کے سفید حصے کو دہی اور شہد کے ساتھ ملا کر فیس پیک تیار کریں۔ اب اس پیک کو تقریباً 20 منٹ چہرے پر لگائیں اور گنگنے پانی سے دھولیں۔ اس سے آپ کی جلد کا خشک پن ختم ہو جائے گا اور چہرہ دمکنے لگے گا۔

4۔ میتھی کی ہری پتیوں کو پیس کر روزانہ رات کے وقت چہرے پر لگائیں اور صبح اٹھ کر اسے گنگنے پانی سے دھولیں۔ ایسا روزانہ کرنے سے چہرے کی زیادہ تر پریشانیاں ختم ہو جائیں گی اور رنگ بھی صاف ہوگا۔

5۔ خشک جلد ہونے کی وجہ سے آپ کو اسکرب کرتے وقت بھی کافی احتیاط رکھنی چاہیے۔ اسکربنگ کے لیے آپ زیتون کے تیل میں چوکر ملا کر استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیل میں شکر ملا کر بھی اسکرب کیا جاسکتا ہے۔

(بحوالہ: www.webduniya.com)

تاثرات: نگر نگر سے

'خواتین دنیا' ہر ماہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے۔ اگر یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ خواتین کے جتنے بھی رسائل شائع ہوتے ہیں ان سب میں 'خواتین دنیا' کو اولیت حاصل ہے۔ 'خواتین دنیا' اپنی نوعیت کا وہ منفرد رسالہ ہے، جس میں شائع ہونے والی تمام تخلیقات یا تو خواتین لکھتی ہیں یا پھر خواتین پر ہی لکھی جاتی ہیں۔ اس میں شائع ہونے والے تمام مضامین معیاری اور معلومات کا خزانہ ہوتے ہیں۔ تزئین اور پرنٹنگ بھی لا جواب ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام تعلیمی اداروں کی خواتین کے علاوہ گھریلو خواتین بھی اس رسالے سے استفادہ کریں۔ جتنے بھی اس رسالے کے خریدار ہیں ان سب کو چاہیے کہ مزید خریدار اور ممبرس بنائیں۔ آپ تمام سے بھی درخواست ہے کہ مزید ممبرس بنائیں تا کہ خواتین اس رسالے سے فیضیاب ہوسکیں۔ اتنا معیاری رسالہ اتنی کم قیمت میں شائع ہونا ناممکن ہے، ہمارے لیے یہ رسالہ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ، اسسٹنٹ پروفیسر، عثمانیہ یونی ورسٹی، کالج فار ویمن، کوٹھی، حیدرآباد۔ تلنگانہ

'خواتین دنیا' دسمبر 2019 موصول ہوا۔ سرورق پر سروجنی نائیڈو کی تصویر دی گئی ہے۔ سروجنی نائیڈو سے متعلق ایک مضمون بھی اس شمارے میں موجود ہے جو شخصیت کے ذیل میں ہے۔ اس مضمون میں مصنفہ نے سروجنی نائیڈو کے حالات زندگی سے لے کر ان کی زندگی کے آخری ایام کو مختصراً نشان زد کیا ہے۔ سروجنی نائیڈو ملک کے لوگوں کے درمیان یگانگت، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کے رشتے پر زور دیتی تھیں۔ وہ برہمن خاندان سے ضرور تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کی پرورش حیدرآباد کے مسلم ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی عوام کے جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ 'ربرو' کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر کا انٹرویو محترمہ زیب النسا کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو میں کچھ بنیادی سوالات جامعہ کی ترقی کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ ایک خاتون کے زیر نگرانی جامعہ مزید ترقی کرے گا۔ شاعرات کے منتخب اشعار بھی قابل داد ہیں۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں تقریباً تمام مضامین خواتین کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ کہانوں کے تحت دو کہانیاں 'تقدیر کا فیصلہ' اور 'بھرم' پیش کی گئی ہیں۔ حسن سخن کے تحت شہناز فاطمہ صدیقی کی دو غزلیں موجود ہیں جو شاعری کے تئیں ان کے ذوق کو اجاگر کرتی ہیں۔ لذیذ پکوان میں مختلف قسم کی ریسیپی موجود ہیں۔ صحت کے تحت خواتین کے تعلق سے مضمون لکھا گیا ہے جو دوران حمل خون کی کمی اور اس سے احتیاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حسن کی نگہداشت میں جلد سے متعلق گھریلو ٹوٹکے موجود ہیں آخر میں خواتین خبرنامہ کے تحت مسلم لڑکیوں کی کارکردگی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں سے پانچ بیٹیاں جج کے امتحان میں کامیاب ہوئی ہیں جو خواتین کی نمائندہ کارکردگی کو ظاہر کرتا ہے۔ 'خواتین دنیا' میں خواتین سے متعلق مضامین موجود ہوتے ہیں جو خواتین کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کے لیے کافی ہے۔

کلثوم، گورکھپور، یوپی

□□□

آسیہ لطیف کو ریاضی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

سکندر آباد 29 دسمبر 2019، سماج نیوز سروس (راشٹریہ سہارا)۔ مولانا آزاد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بھوپال نے شہر کے محلہ قاضی واڑہ ساکن آسیہ لطیف کو ریاضی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے، آسیہ لطیف کے اس تاریخی کارنامے سے جہاں اہل خانہ میں جشن کا ماحول

ہے وہیں متعلقین نے انھیں مبارک باد پیش کی ہے۔ شہر کے محلہ قاضی واڑہ ساکن منیب احمد عباسی کے بیٹے اشل منیب کی دلہن آسفیہ لطیف آبائی طور پر مدھیہ پردیش کے شہر بھوپال سے تعلق رکھتی ہیں جن کی شادی سال 2017 میں اشل منیب سے ہوئی، اشل منیب دبئی کی کسی کمپنی میں ملازم ہیں۔ منیب عباسی نے بتایا کہ آسیہ لطیف شروع سے ہی حصول تعلیم میں ہوشیار رہی ہیں، انھوں نے بھوپال کی برکت اللہ یونیورسٹی سے ایم ایس سی ریاضی اور ایم فل کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد مولانا آزاد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بھوپال سے ریاضی میں تحقیقی کام کیا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر چندن ورما کی زیر نگرانی ہندوستانی اسٹاک مارکیٹ کے اعداد و شمار پر فریکشنل طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے آپشن پرائسنگ کے تجزیہ کی سمت کے تحت تحقیقی کام کیا۔ یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے۔ آسیہ لطیف نے اس کامیابی پر اپنے اہل خانہ اور سسرال والوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ شہر میں ان کے متعلقین میں اس کامیابی سے خوشی کا ماحول ہے۔

ہندوستانی گرینڈ ماسٹر کونیرو ہمپی خواتین ورلڈ ریپڈ چمپئن بنیں

نئی دہلی، 30 دسمبر 2019، قومی تنظیم۔ ہندوستان کی کونیرو ہمپی نے روس کے ماسکو میں چل رہی خواتین ورلڈ ریپڈ شطرنج چمپئن شپ میں چین کی لئی ٹنگ جی کو ٹائی بریکر کی سیریز میں شکست دے کر خطاب اپنے نام کیا۔ ہمپی عالمی خواتین ریپڈ چمپئن بنیں تو ناروے کے میگنس کارلسن نے ہفتہ کو چند منٹ میں مرد خطاب اپنے نام کر لیا۔ ہمپی نے کہا کہ جب میں

نے تیسرے دن اپنا پہلا گیم شروع کیا تو میں نے نہیں سوچا تھا کہ میں سب سے اوپر رہوں گی۔ میں ٹاپ تین میں رہنے کی توقع کر رہی تھی۔ میں نے ٹائی بریک گیمز کھیلنے کی توقع نہیں کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے پہلا گیم

گنوا دیا لیکن دوسرے گیم میں واپسی کی۔ یہ کھیل بہت پر خطر رہا لیکن میں نے اس میں کامیابی حاصل کی۔ آخری گیم میں میں بہتر پوزیشن میں تھی اور پھر میں نے آسان فتح حاصل کی۔ ہمپی نے 12 راؤنڈ میں ہر ایک میں نو پوائنٹس لیے۔جس سے وہ ٹنگ جی کے برابر تھیں۔ دونوں کے درمیان پھر ارمیگیڈون گیم سے فاتح کا فیصلہ ہوا۔ ہمپی نے پہلا گیم گنوانے کے بعد دوسرے گیم میں واپسی کی اور پھر فیصلہ کن گیم میں خطاب جیتا۔

حصار ضلع کی خاتون کوہ پیما انیتا کنڈو نے سر کیا دنیا کے چھٹے براعظم جنوبی امریکہ کی بلند ترین چوٹی اکوکاگوا

حصار، 2 جنوری (یو این آئی) ہمارا سماج۔ ہریانہ کے حصار ضلع کی خاتون کوہ پیما انیتا کنڈو نے اپنی سیون سمٹ مہم کے تحت دنیا کے چھٹے بر اعظم جنوبی امریکہ کی بلند ترین چوٹی اکوکاگوا کو مسلسل 13 دن کی چڑھائی

رہتا ہے۔جس سے کوہ پیما کو ہڈیوں کو گلا دینے والی سردی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس دوران پانچ دن تک کنڈو کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے اہل خانہ کو فکر ستانے لگی تھی۔کوہ پیماؤں کے اس دستے میں آٹھ ہندوستانی اور دو غیر ملکی کوہ پیما شامل تھے۔ان میں سے کنڈو اور اتر پردیش کے وپن کے علاوہ باقی آٹھ کوہ پیما واپس لوٹ آئے تھے۔ اس سے پہلے کنڈو ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا، یورپ اور انٹارکٹیکا کی چوٹیوں کو سر کر چکی ہیں۔ برفانی طوفان کے سبب معمولی دوری سے شمالی امریکہ کی وینالسی چوٹی کو سر کرنے سے محروم ہوگئی تھیں۔انھوں نے چار بار ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی کوہ پیمائی کی ہے۔جس میں تین بار اس پر کامیابی حاصل کی ہے۔نیپال اور چین دونوں ہی راستوں سے ایورسٹ کو انھوں نے فتح کیا ہے۔گزشتہ سال ستمبر میں ہی ایورسٹ کی مانند ہی ماؤنٹ مناسلو پر بھی انھوں نے کامیابی حاصل کی

کے بعد کل سر کر لیا۔انیتا کی قیادت میں دس رکنی کوہ پیما ٹیم میں سے دو ہندوستانیوں کنڈو اور وپن چوٹی پر پہنچے۔کنڈو نے سات ہزار میٹر بلند چوٹی پر ترنگا لہراتے ہوئے ملک کے باشندوں کو نئے سال کی مبارک باد دی ہے۔کنڈو کی ٹیم نے 20 دسمبر کو اکوکاگوا چڑھنے کی شروعات کی تھی۔ یکم جنوری کو دوپہر 12 بج کر پانچ منٹ پر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئیں۔ اکوکاگوا سر کرتے ہوئے متعدد طرح کے خطرے ہر قدم پر بنے رہتے ہیں۔ آکسیجن کی انتہائی کمی اور یہاں پر درجہ حرارت مائنس 35 سے 40 ڈگری

ہے۔ہریانہ پولیس میں انسپکٹر کے طور پر زیر ملازم کنڈو گزشتہ بارہ سال سے کوہ پیمائی سے جڑی ہوئی ہیں۔اس دوران ہریانہ کے وزیر مملکت انوپ دھانک نے کنڈو کی اس کامیابی پر مبارک باد دی ہے۔انھوں نے کہا کہ کنڈو اپنی کامیابیوں سے صرف اکلانا ہی نہیں بلکہ ضلع حصار، ہریانہ ریاست اور ہندوستان کا نام پوری دنیا میں روشن کر چکی ہیں اور لڑکیوں کے لیے ایک ترغیب کا ربن چکی ہیں۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قومی تہذیب کا مسئلہ

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

اردو زبان و ادب پر عربی کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم: محمد طارق

صفحات: 507

قیمت: 225 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

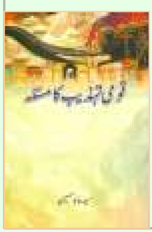

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

کلیاتِ سراج

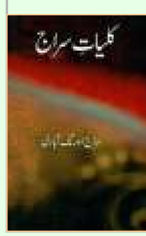

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

اردو املا

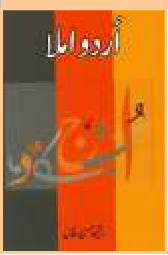

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

تذکرہ شعرائے رام پور

فارسی تصنیف: جارج فانتوم متخلص بہ صاحب وجرجیس

اردو ترجمہ وحواشی: مصباح احمد صدیقی

صفحات: 123، قیمت: 90 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: محمد حسن

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2020, Vol. 4, Issue: 2 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
National Council for Promotion of Urdu Language **ISSN 2581-4826**
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025